بسم اللہ الرحمن الرحیم

کبوتروں کا سپائی پلان

(ناول)

کبوتروں کا سپائی پلان

(ناول)

شاہد جمیل احمد

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 7310944-7231490

ھماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ :

اشاعت	:	جنوری ۲۰۰۴ء
مطبع	:	شرکت پریس لاہور
سرورق	:	عامر
قیمت	:	100 روپے

انتساب

اپنے ننھّے ننھّے، گورے گورے ہاتھوں سے
کالا کالا، گندا گندا کوڑا کرکٹ کریدتے
افغان مہاجر بچّوں کے نام

(دیباچہ)
کبوتروں کا سپائی پلان

شاہد جمیل احمد نے اپنے ناول ''کبوتروں کا سپائی پلان'' میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ انسانی گراوٹ اور عدم یگانگت کا باعث فکری بدحالی ہے۔ جہاں کہیں یہ فکری بدحالی کسی نہ کسی طور یا انداز سے موجود ہوگی وہاں انسانوں کا آپس میں مل جل کر رہنا اور استحصال سے بچ نکلنا قریب قریب ناممکن ہوگا۔

اپنے اس نظریئے کو واضح کرنے کے لیے شاہد جمیل احمد نے ایک ایسے جنگل کو سمبل بنایا ہے جہاں کوّے استحصالی گروہ بن کر دندناتے پھرتے ہیں۔ کبوتر کوّوں کے رحم وکرم پر بڑی مشکل سے جان بچاتے گزر بسر کرتے ہیں۔ کوّوں میں یک جہتی، خود انحصاری اور باہمی مدد کا جو وصف موجود ہے وہ انہیں مجتمع رہنے کی سہولت بہم پہنچاتا ہے۔

کبوتروں کے لیڈر رمہان کبوتر نے کبوتروں کی ابتری کو دیکھ کر یہ پلان وضع کیا کہ چونکہ انسان اخلاقی گراوٹ اور اقتصادی انحطاط کا شکار ہے، وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود صلح جوئی اور مساوات کا سبق نہیں سیکھ سکا اس لیے بہتر یہی ہے کہ ماسٹر پلان ان ہی کے اطوار کو دیکھ کر بنایا جائے۔ کچھ مسنجر کبوتر انسانوں سے تقسیم در تقسیم کا وہ فارمولا سیکھ کر آئیں جو بنی نوع انسان کو مل بیٹھنے نہیں دیتا۔

اس انفرمیشن کو حاصل کرنے کے لیے ایک کالا کبوتر اور سفید کبوتری کو منتخب کیا جاتا ہے اور انہیں اس بات پر مامور کیا جاتا ہے کہ انسانوں سے نفرت کا نسخہ کشید کر کے لائیں اور اس کی مدد سے کوا جاتی میں پھوٹ ڈالی جائے...... کالا سفید جوڑا پہلے تو ہراساں ہوتا ہے لیکن مہمان کبوتر یہ کہہ کر تشفی کر دیتا ہے کہ کبوتروں کی اڑانوں کو پورا تحفظ ملے گا کیونکہ وہ امن کا سمبل ہیں اور وائٹ ہاؤس ان کی پشت پناہی کرے گا۔

یہاں سے ناول مقالے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کبوتر اور کبوتری پہلے ہندو جاتی کے ان پہلوؤں سے روشناس ہوتا ہے جن کی وجہ سے ہندو دھرم اپنے ہی لوگوں کے لیے چار طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ جہاں نفرت کا کاروبار مذہب کا حصہ ہے۔ یہاں کے مندروں میں چھپ چھپا کر وہ نفرت کا وہ کھیل دیکھتے ہیں جو مذہب کے نام پر کھیلا جاتا ہے۔ وطنیت پرستی کا اژدھا بھی انہوں نے یہیں پھنکارتے دیکھا۔ مذہب، معاشرت، معاشیات، علم و ادب، ثقافت سیاست، خون، رنگ، نسل، قانون اور انصاف کے کلہاڑوں سے انسانی برادری کے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ عورت دشمنی کے روپ میں ستی کی رسم کو زندہ پایا۔

اپنے لائحہ عمل کے پیش نظر عمیق مشاہدے اور ٹھوس تجربے کی روشنی میں انسانی ارتقا پر سوچنے کے لیے ان کا دوسرا پڑاؤ قراقرم اور سیاچین کا علاقہ تھا۔

تبت، بلتستان، سکردو، کیلاش کے ہارڈ ایریا۔ مہاتما بدھ کے پیروکاروں کی انحطاط پذیر آبادی جنسی اور معاشی بدحالی کی آئینہ دلد تھی۔ فکری بدحالی کی جہاں سوزی، زبوں حالی یہاں بھی عیاں تھی۔

بعدازاں کبوتروں کا جوڑا بہار کے موسم میں پاکستان پہنچتا ہے لیکن یہ خطۂ ارض جو مذہب کے نام پر معرضِ وجود میں آیا، اپنے مذہب کی یک رنگی کے باوجود

تفرقے کا شکار ہے۔ یہاں جھگڑا بین المذاہب نہیں بین الانسان ہے۔ تشدد، تخریب کاری اور باہمی نظریاتی منافرت نے عام انسان کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ یہاں سے کبوتر کبوتری لندن کے ایک گرجا گھر میں پہنچے جہاں انہوں نے فکری بدحالی کا ایک اور منظر دیکھا، رہبانیت نے عام عیسائی کی زندگی میں مسرت لانے کے بجائے زہر کھول رکھا تھا۔

شاہد جمیل احمد کا خیال ہے کہ مذاہب جو بظاہر انسان کو آپس میں صلح و آتشی کا سبق سکھانے آئے تھے بالآخر انسان کی منفی سوچ کا شکار ہو گئے اور مل بیٹھنے کی راہیں مسدود ہوتی چلی گئیں۔ اب یہ جوڑا اپنا ماسٹر پلان لیکر جنگل میں لوٹتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کوّوں کو چھوٹے چھوٹے مفاداتی اور غیر نظریاتی گروہوں میں تقسیم کیا جائے تاکہ یہ ایک نظام کی صورت نسل در نسل کوّوں کی پھوٹ کا باعث ہو۔

یہاں پر ایک اور سوچ ابھرتی ہے کہ انسانوں کے نظام ہائے تعلیم نے بھی لوگوں کو طبقوں میں بانٹنے کا اہم کام کیا ہے اس طریق پر بھی کچھ علم حاصل کیا جائے، اب کبوتر تعلیم پر رپورٹ تیار کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ناول کا آخری حصہ نظامِ تعلیم کی قباحتوں پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

پاکستان میں تعلیم لوگوں کو چار حصوں میں بانٹنے کی مرتکب ہوئی۔ براؤن صاحب بنانے والا لارڈ میکالے سے لیکر موجودہ عہد کے متمول گھرانوں کا مغربی تعلیم میں انہماک اور باقی طبقوں کی تعلیمی کس مپرسی اور بدحالی پر تفصیلی تبصرہ بڑا مربوط جائزہ ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کو ایک علیحدہ اور مظلوم گروہ بنانے میں ظلم کے جو ہتھکنڈے پیش پیش ہوتے ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔ یہ مظالم بظاہر عورت پر کئے جاتے ہیں، درپردہ سوسائٹی کو بانٹنے اور بکھرنے پر آمادہ کرنے کا عمل ہے۔

یہاں پہنچ کر شاہد جمیل اپنے نظریئے کو پکی گانٹھ لگاتے ہیں اور یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہاں فکری بدحالی ہوگی وہاں مساوات، بھائی چارہ، افہام وتفہیم کی گنجائش کم ہوگی۔ انسانی سوچ نے ساری دنیا کو تفکر کی روشنی میں بڑی وسعتیں عطا کی ہیں، اسے سائنسی ترقی سے روشناس کرایا ہے لیکن ذکر منفی سوچ کا ہے جس نے مذہبی، معاشرتی فرقہ پردازی کو جنم دیا۔

جمیل نے گہرے مشاہدے، باریک بینی اور دردمندی سے اس ناول کو لکھا ہے۔ کئی مقامات پر ادب کے ڈانڈے صحافت سے جا ملے ہیں۔ کہانی، رپورٹ، مضمون، مقالہ آپس میں گڈمڈ ہیں لیکن یہ ناول اردو کے ایسے قارئین کو ضرور پڑھنا ہوگا جو آرزومند ہیں کہ کبوتر امن کا سمبل بن کر ہماری فضا میں بے خوف وخطر اڑتا پھرے۔ اسے نہ بندوق کا خوف ہو نہ انسان کا...... ہماری فکری بدحالی کسی طور ختم ہو جائے اور ہم یک جہتی کے دھاگے میں ایسے پروئے جائیں کہ ظاہری تفریق کے تمام مظاہر کے باوجود اس دھاگے میں کبھی کمی نہ آئے۔

زمانہ اپنے مشاہیر کی تلاش میں رہتا ہے، اگر جمیل لکھتے رہے اور ایسی ہی دور رس نگاہ رکھی تو وہ وقت دور نہیں جب وہ اردو ادب کے مشاہیر میں شامل ہو جائیں گے۔

دعاؤں کے ساتھ

بانو قدسیہ

۲۷-۷-۲۰۰۱

حرفِ آغاز

میں نے یہ ناول اپنی افسانے کی دو کتب یعنی ''آؤ فاختہ گھر چلیں'' اور ''جاگرن'' کے فوراً بعد باقاعدہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ ناول شروع ہی رہا کہ اس دوران میری مزید دو کتابیں یعنی افسانے کی ''سرخ گلاب'' اور پنجابی شاعری کی ''نی مائے'' بھی نہ صرف یہ کہ مکمل ہوگئیں بلکہ چھپ بھی گئیں۔ سچی بات ہے کہ ناول کو مکمل کرنے کے لیے جس لمبے سمے، ٹرانس، مستقل مزاجی اور موڈ کی ضرورت تھی اس کا اہتمام میرے لیے نجی مصروفیات اور سروس کے جھنجھٹ کی وجہ سے ان دِنوں خاص طور پر ممکن نہ تھا۔ یوں بھی یہ ناول کوئی سیدھی سیدھی لو اسٹوری تو تھا نہیں کہ جسے جب چاہوں لکھوں یا جیسے جیسے چاہوں انجام پذیر کروں۔ یہاں تو غم کی چتائیں جلانا تھیں اور درد کے دریا بہانے تھے۔ دل کے دم پخت پھپھولوں کو پھرولنا تھا اور اپنے ناک، منہ اور آنکھیں کھول کر سڑاند میں ہاتھ ڈالنا تھا۔

صاحبو! افسانہ ہو یا ناول یا شاعری آورد کے بس کا روگ نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صنف اس وقت تک نہیں لکھی جاتی جب تک دل نہ کہے۔ دل اس وقت تک نہیں کہتا جب تک اپنے ماحول اور معاشرے سے تجربے و مشاہدے کے ذریعے احساس کے تیز نشتر وجود میں نہ اتارے جائیں۔ پھر دل جو بات کہے وہی اصل وجدان ہے چاہے صفحۂ قرطاس پر شعر کی صورت نمودار ہو یا کہانی کے روپ میں۔

اگر کسی میں واقعی آتش ہے، دم خم ہے، مستقل مزاجی ہے اور اگر واقعی کوئی لکھنے والا ہے تو اسے اس کے رنگ ڈھنگ میں لکھنے دیا جانا چاہئے کہ ہر لکھنے والے کا اپنا اسلوب، مشاہدہ، تجربہ حتیٰ کہ لفظیات بھی ایک خاص حد تک مخصوص اور منفرد ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں خاص طور پر یہ رواج ہے کہ کسی بھٹہ خشت مزدور کی طرح شاعر یا ادیب کو بنا بنایا سانچہ پکڑانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اینٹیں تھپنے، شعر کہنے اور کہانی لکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ساری اینٹیں ایک جیسی ہوتی ہیں کہ ان کے پیچھے فکر کی بجائے فقط کرافٹ کارفرما ہوتا ہے لیکن ساری عمارتیں ایک دوسری سے مختلف ہوتی ہیں کہ ان کے پیچھے سوچ، جذبہ بشمول کرافٹ موجزن رہتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی تمام زبانوں کے تمام ادیبوں کی کہانیاں اپنے اسلوب، بیان اور اثر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اردو کے سارے افسانہ نگار اور ناول نگار کیسے بڑے لوگوں کے رنگ میں لکھنا شروع کردیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ادب اور غیر ادب پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ غیر ادب اتنا اہم ہوتا ہی نہیں کہ اس کے سقم نکالنے یا اسے ماننے یا نہ ماننے کی نوبت آئے۔

بدقسمتی سے ادب دو سطحی ہوگیا ہے۔ ایک سطح تخلیق کی سطح ہے کہ جس کے لیے کسی چکا چوند کی ضرورت نہیں بلکہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی استحصال کے ردعمل کے طور پر خودکار نظام کے تحت یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچتا رہتا ہے۔ ادب کی دوسری سطح اس کی ترویج کی سطح ہے۔ ادب کی یہ سطح بدعنوانی اور کرپشن کی وجہ سے جمود کا شکار ہے جس وجہ سے عام طور پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا پورا ادب جمود کا شکار ہے۔ تمام تر کرپشن، ناانصافی اور گروہ بندی کے باوجود ادب کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جو لوگ اس سے ادبی چولہے جلانے یا سیاسی دیگیں پکانے کا کام لینا چاہتے ہیں یہ ان کا کام بھی کرتا جارہا ہے اور جو صرف اس سے دل سلگانے کے سزاوار ہیں یہ

--

ان کا دامن بھی بھرتا جا رہا ہے۔ اخبارات کے ادبی صفحات پر قابض گنے چنے ادیب دو چار ماہ بعد یہ سروے چھاپ دیتے ہیں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں بھی کتاب اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے لیکن میں دعوے سے یہ بات کہتا ہوں کہ ہمارے نوے فیصد ادیب بذاتِ خود کتاب سے دور ہیں اور جدید ادب سے قطعی بہرہ ور نہیں۔ خیر! لکھنے والوں کو ان مسائل بلکہ مصائب سے پریشان ہو کر اپنا قبلہ نہیں موڑنا چاہئے کہ یہ مسئلے تو ازل ازل کے مسئلے ہیں۔ ہم لوگوں نے خود ہی اپنے معاشرے بنائے ہیں اور خود ہی اپنے مسئلے بھی۔ گویا ہم لوگ خود ہی اپنا سب کچھ ہیں۔ ایک نظم دیکھئے۔

''حیات جاوداں''

ہمیں کچھوے کے پاؤں کی طرح
اپنی انا کے خول میں فوراً
سمٹ جانے کی عادت ہو گئی ہے
کبھی دلدل کنارے کا ہش تدبیر کی خاطر
کبھی اپنی ضرورت بھی پڑے تو بھی
ہماری دستیابی واقعی مشکوک ہو جائے
کہ ہم نے تو!
بدلتے منظروں سے جی چرا کر!
اپنی آنکھوں پر!
سیاہ عینک لگالی ہے

دھڑکتے دِل کو سائنسدان بن کر!
ایک پرزہ سوچ رکھا ہے
کسی کچھوے طرح اپنی انا کے خول میں بیٹھے
تنفس کو حیاتِ جاوداں کا نام دیتے ہیں
حیاتِ جاوداں کہ جس کی ساری جاودانی بھی
کسی دلدل کے مخروطی کنارے پھیلنے تک ہے

آخر میں ناول کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ یہ میرا ناول ہے۔ زندگی کے بارے میں میرا اپنا مشاہدہ و تجربہ ہے۔ معاشرت، سیاست، تعلیم، مذہب اور اقتصاد سے متعلق میرے اپنے نظریات ہیں کہ جن کا مرکز و محور بہرحال انسان سے ہمہ گیر محبت اور لازوال یگانگ کے سوانہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ اب میرے دل سے وہ ملال جاتا رہا ہے جو مجھے قومیت پرست نہ ہونے اور اپنے اردگرد جھنڈیاں لہرانے اور ون سونے گیت گانے والے اکثریتی گروہ کو دیکھ کر ہوا کرتا تھا۔ یہ بات تو طے ہے کہ Common Sense is not Common اور Special Sense تو ہوتی ہی سدا سے مفقود یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اپنے مخصوص فکری پس منظر کے زیر اثر میں نے اپنی ساری کہانیاں لکھی ہیں اور یہ ناول بھی۔ تصنع کی ضرورت نہ مجھے کبھی پہلے محسوس ہوئی تھی اور نہ اب ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک تخلیقی بے چینی اور کرب اور خلا ناول لکھنے سے پہلے بھی محسوس کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ بقول اقبال۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنون کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا!
ایک تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو!!

آخر میں بانو آپا کی شفقت کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا مگر میرے پاس موزوں الفاظ نہیں، فقط یہی کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے اور لمبی عمر دے۔

شاہد جمیل احمد
مہر سٹریٹ، احتشام کالونی
سوئی گیس آفس روڈ گوجرانوالہ
فون:- 0431-890181

کبوتروں کا سپائی پلان (ناول)

سارے موسم تو سورج سے ہوتے ہیں۔کبوتروں نے تو ایک مدت سے سورج ہی نہیں دیکھا تھا۔سارے جنگل پر کوؤں کا قبضہ تھا اور وہ آسمان پر کالے بادلوں کی طرح چھائے رہتے تھے۔ جیسے ہی کوئی کوا مرتا، کائیں کائیں کی آواز سے پورا جنگل گونجنے لگتا۔کوؤں کے احتجاج کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک آندھی نہیں آتی اور مرے ہوئے کوّے کے پروں کو مٹی میں نہیں دبا دیتی یا پانی میں نہیں بہا دیتی۔کوؤں کی وجہ سے امن پسند پرندے ہی کیا بڑے جانور بھی بہت تنگ تھے۔جنگلی بیلوں اور بچھڑوں کی جلد پر جگہ جگہ گھاؤ بنے ہوئے تھے جن سے کوؤں کی چونچوں کی وجہ سے ہر وقت خون رستا رہتا تھا۔کوّے اتنے خودسر ہوگئے تھے کہ بھینسوں کے کان کی میل کے ساتھ بوٹیاں بھی کھا جاتے۔کئی بھیڑیں کوؤں کی گندی چونچوں کے زخم سکھاتے سکھاتے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں۔میمنے اور چھیلے اپنے کھائے ہوئے کھروں کے ساتھ ادھر ادھر لنگڑاتے پھرتے تھے۔سبھی بڑے درختوں پر کوؤں کے گھونسلے تھے اور کوئی دوسرا پرندہ ان پر گھونسلہ بنانا تو کجا بیٹھ تک نہیں سکتا تھا۔یہ تو بڑے جانوروں کا حال تھا اور چھوٹے پرندوں کی زندگی تو بالکل ہی اجیرن ہوگئی۔کوؤں کے علاوہ اس جنگل میں کبوتروں اور فاختاؤں کی اکثریت تھی۔فاختائیں تو کوؤں کے جبر کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک ایک دو دو کر

کے نقل مکانی کر گئیں مگر کبوتر جھاڑیوں وغیرہ میں چھپ کر گزارہ کرتے چلے آ رہے تھے۔ کبوتر بھی چاہتے تو کسی ایسے جنگل کا رخ کر جاتے جہاں کوے نہ ہوں مگر اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ کوے کبھی بھی اس نئے جنگل میں نہیں آئیں گے۔ کوے تو جیسے موت کے فرشتے کی طرح کبوتروں کے ذہنوں پر سوار ہو گئے تھے۔ یوں بھی اتنے خوبصورت جنگل اور اس کے مغرب میں بہتی میٹھے پانی والی ندی کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ کوؤں کی تمام تر لوٹ کھسوٹ کے باوجود سچے موتی، باریک روڑ اور خود رو پودوں کے چکنے بیج کبوتروں کی ضرورت سے اب بھی زیادہ تھے۔ فی الحال کبوتروں کو پیٹ کا نہیں بلکہ دماغ کا مسئلہ درپیش تھا۔ جب سے انہوں نے صدیوں کے ارتقا کے نتیجے میں سوچنا شروع کیا تھا تب سے ان کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ بہار کے گلابی موسم میں کم اونچے مٹیالے پہاڑ کی چوٹی پر بھل کریدنے اور باریک روڑ چگنے کے ساتھ ساتھ دھوپ سینکنا کبوتروں کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ اسی پہاڑ پر پہلی جھولی کے لیے کبوتروں کے زیادہ تر جوڑے بنتے تھے جن کی کنواری گٹرگوں چرواہوں اور سیاحوں کے دلوں میں ہیجان برپا کر دیتی تھی۔ کبوتریاں کبوتر چونچوں میں چونچیں ڈال کر افزائش کے پیمان باندھتے اور دم سے دم ملاتے تھے۔ مہان کبوتر کی موٹی کبوتری سے عمر بھر کی دوستی بھی اسی جگہ پر ہوئی تھی۔ مہان کبوتر اپنی کسی موسمی ہجرت کی اڑان کے دوران موٹی کبوتری کو کسی گاؤں پر اڑتے اڑتے پٹالایا تھا۔ موٹی کبوتری شروع شروع میں بہت ہی مغرور تھی۔ دم سے دم ملانا تو درکنار چونچ سے چونچ نہیں ٹکرانے دیتی تھی۔ موٹی کبوتری کی دم دیکھ کر کئی کبوتروں کے دل میں اس سے دم ملانے کی خواہش پیدا ہوئی مگر مہان کبوتر کے ڈر سے کوئی بھی اس کے قریب نہ جا سکا۔ ایک دوپہر جب موٹی کبوتری پنجوں کو پیٹ کے پروں میں دبائے ستا رہی تھی تو مہان کبوتر نے اسے دبوچ لیا۔ شاید موٹی کبوتری بھی دل سے یہی چاہتی تھی کہ اس نے بھی انگریزی فلموں کی البیلی اور نوخیز لڑکی کی

طرح خود کو مہان ٹارزن کے سپرد کر دیا۔ اپنی پہلی جھولی میں موٹی کبوتری نے چار انڈے دیئے۔ مہان کبوتر بہت خوش تھا کیونکہ کوئی کوئی کبوتری چار انڈے دیتی ہے ورنہ زیادہ تر تو دو انڈے ہی دیتی ہیں۔ جب موٹی کبوتری انڈوں پر آئی تو گھونسلہ بنانا بھی مہان کبوتر کے لیے ایک نیا ہی تجربہ تھا۔ مہان کبوتر جنگلی کبوتروں کی نسل سے تھا اور جنگلی کبوتر گھونسلے نہیں بناتے بلکہ پتھروں کے نشیب میں انڈے دیتے ہیں۔ موٹی کبوتری پالتو تھی اس لیے اسے گھونسلہ بنانے کا تجربہ تھا مگر سارے تنکے تو اسے مہان کبوتر نے ہی لا کر دیئے تھے۔ مہان کبوتر موٹی کبوتری سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ کبھی وہ اپنے کالے پنجوں سے اس کے گلابی پنجوں میں پڑی گلابی جھانجھنیں بجاتا اور کبھی مستی میں اس کی چونچ میں چونچ ڈال کر چوگ کھلاتا۔

مہان کبوتر اور موٹی کبوتری کا گھونسلہ ایک جھاڑی دار بیری کی شاخوں پر تھا۔ اگرچہ یہ جگہ بہت محفوظ تھی اور پتوں کی اوٹ بھی تھی مگر کالے کوّوں کی بدمعاشی کا ڈر ہر وقت رہتا تھا۔ کوّوں کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ ایک دن ایک کوّے نے موٹی کبوتری کو انڈوں پر بیٹھے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا، بدمعاش اکہری چال چلتا گھونسلے کے پاس آیا اور کبوتری پر جھپٹ پڑا۔ کبوتری ڈر کے مارے پروں اور پیٹ پر کانٹے چبھاتی گھونسلہ چھوڑ کر گھاس پھوس میں چھپ گئی۔ بدمعاش نے بے دردی سے چاروں انڈوں کو لوہے ایسی چونچ سے پھوڑا اور انہیں پینے کے بعد لاپروائی سے اپنے گندے پنجوں سے خول نیچے پھینک کر مکار آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا اڑ کر سامنے والے کیکر پر جا بیٹھا۔ مہان کبوتر آیا تو بیچاری کبوتری بھی باہر نکل آئی۔ مہان کبوتر نے ٹوٹے ہوئے انڈوں کے خول دیکھے تو اس کا دل بجھ گیا۔ غصے میں اس نے کبوتری کے سر پر دو تین ٹھونگے مارے تو وہ بیچاری مزید خوفزدہ ہوگئی۔ دونوں کبوتر انڈوں کے خولوں کے پاس کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ موٹی کبوتری نے اگلی جھولی کی آس دلا کر مہان کبوتر کو بہت تسلی دی مگر ان کے دکھ کی شدت میں

ذرا کمی نہیں آئی۔ موٹی کبوتری نے مہمان کبوتر کو بتایا کہ انسان بھی خاص کر اپنی پہلی اولاد کے مرنے کا بہت رنج کرتے ہیں۔ اسے اپنے کبوتر باز مالک کے گھر کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کا مالک اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ ابھی بیس سال کا بھی نہیں ہوا ہوگا کہ اس کی ماں اس کے لیے اپنی بھانجی کو بیاہ لائی۔ سولہ سال کی نٹ کھٹ دولہن اور بیس سال کے نوجوان دولہے کا آپس میں بہت پیار تھا۔ کچھ ہی مہینوں میں پیار ہی پیار میں امید بندھ گئی۔ ہلکی پھلکی، تتلی کی طرح اڑتی پھرتی دولہن کے لیے چلنا پھرنا محال ہوگیا۔ ساس سسر اور شوہر سبھی اس سے مزید محبت کرنے لگے۔ ہر کوئی اس کے پاؤں تلے ہاتھ بچھانے کو تیار تھا۔ ساس آئے روز اسے حکیم کے پاس لے جانے لگی۔ کھانے پینے کا مکمل دھیان رکھا جانے لگا۔ جس قدر احتیاط سے کام لیا گیا اسی قدر بدقسمتی آڑے آئی۔ ابھی دس ہفتے ہی گزرے تھے کہ بیچاری نلکے کی چار دیواری میں پھسل گئی۔ خراب حالت کے باعث شہر کے ہسپتال میں لے جایا گیا مگر وہاں سے سب روتے پیٹتے گھر واپس آئے۔ دولہن کی جان تو بچ گئی مگر بچہ ضائع ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد تو جیسے اس جوڑے کے نصیب کی دیوی ہی روٹھ گئی، نہ پاؤں بھاری ہوا اور نہ اسے پھسلنے سے بچانے کی نوبت آئی۔ چار پانچ سال گزرے تو گھر کا ہر فرد دولہن کا دشمن بن گیا۔ سسر چپ رہنے لگا، ساس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھالیں اور ہر دم محبت کا ورد کرنے والا شوہر بات بات پر لڑنے جھگڑنے لگا۔ دولہن کی زندگی جہنم بن گئی اور وہ سب سے چھپ کر رونے لگی۔ دولہن کی حالت کو یاد کر کے موٹی کبوتری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مہمان کبوتر ایک دو دن تو پریشان رہا مگر پھر ویسے کا ویسا ہوگیا۔ اگر اس کے اندر پہلی جھولی کی بربادی کا کوئی دکھ تھا بھی تو اس نے کبوتری کو کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ موٹی کبوتری نے یہ سوچ کر سکھ کی سانس لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ پرندے ہیں خدانخواستہ انسان نہیں۔

پھر تین تین چار چار ماہ کے وقفے سے کئی جھولیاں آئیں، کتنے ہی انڈے ٹوٹے مگر بہت سے انڈوں سے بچے بھی نکلے۔ اب تو مہان کبوتر کے بچوں کے بچے بھی انڈوں بچوں والے تھے۔ کوئی گھونسلہ گرتا، کوئی انڈا ٹوٹتا یا کوؤں کی بدمعاشی کا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو مہان کبوتر کو اپنی پہلی جھولی یاد آ جاتی۔ پہلی جھولی کی یاد کے ساتھ ہی موٹی کبوتری کی یاد اسے تڑپا دیتی۔ موٹی کبوتری نے زندگی کے کئی سال اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب جبکہ اس نے انڈے دینے بند کر دیئے تھے تو بھی مہان کبوتر اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ پچھلے مون سون میں موٹی کبوتری کو رطوبت کی بیماری لاحق ہوگئی۔ دو تین دن اس کی چونچ سے پانی بہتا رہا اور آخر کار ایک رات وہ مر گئی۔ صبح موٹی کبوتری پر کوؤں کی نظر پڑی تو انہوں نے کائیں کائیں کر کے سارے جنگل کے کوؤں کو جمع کر لیا۔ کسی کی چونچ میں بوٹی آئی، کسی کی پر اور کسی کی چونچ میں پوٹ اور یوں مہان کبوتر کی آنکھوں کے سامنے موٹی کبوتری کا نام و نشان اس طرح مٹ گیا جیسے وہ کبھی اس دنیا میں تھی ہی نہیں۔ کوؤں کے ظالمانہ رویے نے مہان کبوتر کے دل میں ان کے خلاف کوٹ کوٹ کر نفرت بھر دی۔ اب وہ ہر صورت کوؤں سے ان کی ایک ایک زیادتی کا حساب لینا چاہتا تھا۔ موٹی کبوتری کے مرنے کے بعد کوؤں کی مخالفت کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔ اب وہ جنگل کے ایک ایک کونے میں کبوتروں کے پاس جاتا اور کوؤں کے ظلم کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت اور غصہ اجاگر کرتا۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران اس کے پر نیچے ڈھلک گئے اور اس کی بوڑھی چونچ کھلی رہنے لگی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ سالہا سال کوؤں کے ستم کا شکار رہ کر دوسرے کبوتروں میں بھی ان کے خلاف زبردست نفرت پائی جاتی تھی۔ بڑے بوڑھے کبوتر تو ہر وقت سر جوڑ کر بیٹھے رہتے تھے۔ کوے اب تک اتنے زیادہ ہوگئے تھے کہ کبوتروں کی نسل بندی تک کی نوبت آ گئی تھی۔ اب تو اکا دکا انڈا ہی کوؤں کی نظر بد سے بچتا

تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کبوتر اس نتیجے پر پہنچے کہ نازک چونچوں کے ساتھ کوؤں پر حملے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح تو وہ ان کو اور بھی اپنا دشمن کرلیں گے اور نتیجتاً بہت سا جانی نقصان ہی ان کے حصے میں آئے گا۔ جوان کبوتروں نے بڑے بوڑھے کبوتروں سے جب یہ سنا کہ وہ کوؤں سے نہیں لڑ سکتے تو ان کے خون نے جوش مارا اور وہ غصے اور ناامیدی کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہوکر کہنے لگے کہ اس طرح تو ہم کبھی کوؤں کے غاصبانہ تسلط کوختم نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ہماری نسلیں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ مہان کبوتر نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور بڑے تحمل سے انہیں سمجھایا کہ بلاواسطہ لڑنے اور خون خرابہ کرنے بلکہ کروانے کے علاوہ بھی کئی ایسے طریقے ہوسکتے ہیں جن پر عمل پیرا ہوکر دشمن کو عبرت ناک سزا دی جاسکتی ہے، اپنی آئندہ نسلوں کو ان کے جبر سے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس سارے کام کے دوران تم لوگوں کو نہایت صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کے فوری بعد تم کوؤں پر قابو پالو گے لیکن اتنا یقین ضرور دلاتا ہوں کہ اگر تم لوگ اس سوچ کو اپنی آنے والی نسلوں میں مسلسل منتقل کرتے رہے تو کچھ عرصے کے بعد کامیابی یقیناً تمہارے قدم چومے گی۔ کل کسی نے نہیں دیکھا اور ہوسکتا ہے کہ مجھ سمیت تم میں سے بہت سے کبوتر اس کوشش کا ثمر دیکھنے سے پہلے ہی کوؤں کی خوراک بن جائیں مگر زندہ رہنے کا مقصد صرف گن گن کر اپنی سانسیں پوری کرنا ہی نہیں بلکہ خود کو، اپنی نسلوں کو آنے والے کل کے حالات کے لیے تیار کرنا بھی ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ جو مرتا ہے مر جائے مگر جو زندہ بچے وہ ہماری طرح چھپ چھپ کر زندگی بسر نہ کرے۔

چند بوڑھے کبوتروں کو چھوڑ کر جن سے مہان کبوتر پہلے ہی مشورہ کر چکا تھا، باقی سارے کبوتر حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی بے

چینی بڑھ رہی تھی۔ مہمان کبوتر نے جب سارے کبوتروں کی توجہ اچھی طرح حاصل کر لی تو ان کے تذبذب کو بھانپتے ہوئے ان سے کہنے لگا کہ تم لوگ انسانی مخلوق سے تو یقیناً واقف ہوگے۔ ہم سارے کبوتروں نے ہی وقتاً فوقتاً انسانوں کا بھرپور مشاہدہ کیا ہے۔ بلاشبہ انسان دنیا کی ذہین ترین مخلوق ہے۔ اپنی تمام تر خصوصیات اور اوصاف کے باوجود یہ مخلوق شروع دن سے اخلاقی انحطاط اور اقتصادی گراوٹ کا شکار رہی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا وجوہات ہیں جو تمام تر وسائل کی دستیابی کے باوجود لاکھوں انسانوں کو ہر سال بھوک کی بھینٹ چڑھا رہی ہیں۔ وہ کونسا مذہبی نسخہ ہے جو ان کی پھوٹ در پھوٹ میں عمل انگیز کا کام کرتا ہے۔ وہ کونسا تعلیمی عمل ہے جو ان کو دن بدن اشرف سے بدتر بنا رہا ہے۔ تقسیم در تقسیم کا وہ کونسا فارمولا ہے جو ان کے مل بیٹھنے میں مانع ہے۔ ملکی سرحدوں اور خاردار باڑوں کے پیچھے کونسی سوچ کارفرما ہے۔ ایک دوسرے پر بلاخوف تشدد کے اجازت نامے پر کس کے دستخط ہیں۔ کس نے کس کو کس طرح اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ کون کس سے کتنی نفرت کرتا ہے اور یہ نفرت غیر محسوس طریقے سے نسل در نسل کس طرح منتقل ہوتی ہے۔ وہ کونسا اقتصادی نظام ہے جو کچھ کو کچھ پر فوقیت دے کر کچھ کو کچھ کی ہلاکت پر اکساتا ہے۔ وہ کونسی ماں ہے جو اپنے بیٹے کے ہاتھوں کسی دوسری ماں کے بیٹے کو قتل کروا کر فخر سے اپنا سر بلند کرتی ہے۔ وہ کونسا باپ ہے جو اپنے بیٹے کے ہاتھوں کسی دوسرے باپ کی بیٹی کی عزت سر بازار نیلام کروا کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ کونسا انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں فرحت محسوس کرتا ہے۔ وہ کیسی سینا ہے جو قدم قدم اپنے ہی انسانوں پر زندگی تنگ کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو رہی ہے۔ وہ کونسے ہاتھ ہیں جو انسانی تباہی کا سامان بنا اور بیچ رہے ہیں۔ وہ کونسا ضابطہ اخلاق ہے جو تمام تر دعوؤں کے باوجود انسانوں کے بیچ رنگ، نسل اور خون کی بنیاد پر وسیع تر خلیج کھینچ رہا ہے۔ وہ کونسا سبق ہے جسے

رٹ کر یہ مخلوق انسان سے طوطا بن گئی ہے۔ وہ کیسا ادب ہے جس کی تمام تر بنیاد جھوٹ اور کم ظرفی پر استوار ہے۔ عامیانہ رویوں کو معاشرے میں متعارف کرانے اور پذیرائی دلانے میں کونسی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ انسانی سوچ جن چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹی ہوئی ہے ان کی اساس کیا ہے۔ وراثت اور حکومت سے متعلق عائلی قوانین کی حقیقت اور مقصد کیا ہے۔ رشوت، سفارش اور اقربا پروری ایسی تباہ کار قوتیں معاشروں اور گروہوں میں کس طرح پروان چڑھتی اور پنپتی ہیں۔ مزید یہ کہ انسان ایسی سمجھ دار مخلوق کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کونسے عوامل پیش پیش ہیں اور ہم انہیں کوؤں کے خلاف کس طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم کبوتروں نے ایک مدت سے سورج کی شکل نہیں دیکھی۔ پورے جنگل پر کوؤں کا قبضہ ہے، اور وہ کالے بادلوں کی طرح آسمان پر چھائے ہوئے ہیں۔ جو کوئی کوؤں کی بدحالی کا سورج تلاش لائے گا اس کا نام کبوتروں کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ جہاں سارے کبوتر اس موضوع سے متعلق اپنے تئیں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے وہاں میں اور میرے دیگر ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کالے کبوتر اور سفید کبوتری کو مشن کے تحت انسانی بستیوں کی طرف روانہ کیا جائے تا کہ وہ ان کے درمیان رہ کر ان وجوہات کا مطالعہ و مشاہدہ کر سکیں جو انسانوں کی طرح کوؤں میں پھوٹ ڈالنے کا سبب بن سکیں۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ ان دونوں کبوتروں نے حال ہی میں اپنا جوڑا بنایا ہے اور ان دنوں سفید کبوتری انڈوں پر بیٹھی ہے لیکن کسی بڑے مقصد کے لیے چھوٹی چھوٹی خواہشات اور جذبات کی قربانی کامیابی کی طرف پہلا قدم تصور کیا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کالے کبوتر اور سفید کبوتری کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور وہ بخوشی اس کام کی تکمیل کے لیے رضا مند ہو جائیں گے۔ جہاں تک ان کے انڈوں کا سوال ہے تو ان کو خاکی کبوتری سی لے گی۔ مہان کبوتر نے مزید بتایا کہ کالے کبوتر اور سفید

کبوتری کا انتخاب بڑی سوچ بچار کے بعد ان کی انسان فہمی کو مدنظر رکھ کر عمل میں آیا ہے۔ اب سارے کبوتروں کی نظریں کالے کبوتر اور سفید کبوتری پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں کبوتر اپنی انقلابی سوچ کی بنا پر پہلے ہی سارے کبوتروں میں مقبول تھے۔ اپنے اسی جذبہ حریت کی پاسداری کرتے ہوئے دونوں کبوتروں نے مہمان کبوتر کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں۔

مہمان کبوتر نے اپنا بیان مکمل کرلیا تو سارے کبوتر ایک ایک کر کے عقیدت سے اس کے پروں کو کھجاتے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف جانے لگے۔ مہمان کبوتر ان کو دیکھ کر دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کی جو مخلوق بھی مغلوب ہو جائے اس کے افراد میں مہمان پرستی کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ تقریباً سارے کبوتر جا چکے تو مہمان کبوتر نے کالے کبوتر اور سفید کبوتری کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا کہ تمہارے پاس تین دن ہیں۔ اس دوران تم اپنی تیاری مکمل کرلو اور رات کے وقت جب کوّے سو رہے ہوں تو تم اڑ جاؤ۔ جہاں تک تمہاری حفاظت کا سوال ہے تو ہم نے اس کا بندوبست کرلیا ہے۔ تم لوگ وائٹ ہاؤس کے نمائندوں کے طور پر پوری دنیا میں آزادی سے اڑ سکو گے۔ تمہاری حفاظت اور آزادی کے بدلے جنگل کے سارے پرندے اس بات پر راضی ہوگئے ہیں کہ پاما کے پورب میں قائم نشلی ادویات کی فیکٹری کے لیے تین سال کی بیٹیں دیں گے۔ اب تم جاؤ اور تیاری شروع کرو۔ مہمان کبوتر سے اجازت ملنے کے بعد کالا کبوتر اور سفید کبوتری اپنے گھونسلے کی طرف جانے لگے۔ خوشی اور فکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کالے کبوتر نے سفید کبوتری کی طرف دیکھا جس کی حالت بھی اس وقت اس سے مختلف نہیں تھی۔ گھونسلے کے پاس پہنچ کر کبوتری نے اپنے انڈوں کو چونچ سے پلٹا اور انہیں محبت سے اپنے پیٹ کے پروں تلے دبا کر بیٹھ گئی۔ کبوتر بھی اس کے پاس ہی انگلی جتنی موٹی ٹہنی پر مگر گھونسلے سے باہر بیٹھ کر دم کو کھجانے لگا۔ اس نے ایک نظر انڈوں پر

بیٹھی کبوتری کو دیکھا اور چونچ سے اس کی گردن کھجانے لگا۔ مٹیالے پہاڑ پر جلسے کے انتظامات کی وجہ سے دونوں کبوتر تھکے ہوئے تھے اس لیے دونوں اپنی گردنیں سمیٹ کر اور آنکھیں موند کر سو گئے۔ رات چاندنی تھی اور جنگل میں ہر سو جھینگر بول رہے تھے۔ گھنی جھاڑیوں میں جگنو آسماں کے ستاروں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ دن کی نسبت جنگل کی راتیں روشن اور پرسکون تھیں۔ کوؤں کے بادل پورا دن آسمان پر چھائے رہنے کے بعد رات کو درختوں پر بیٹھ جاتے تھے تو آسمان کی دھندلی شکل دیکھائی دینے لگتی تھی۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو سے پورا جنگل حجلۂ عروسی کی طرح مہک رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بے امن کوا زور سے پر پھڑ پھڑاتا تو کچھ لمحوں کے لیے پرسکون ماحول سبوتاژ ہونے لگتا اور ننھے پرندے اپنے گھونسلوں میں بدک جاتے مگر پھر کچھ لمحوں کے بعد سناٹا چھا جاتا۔

آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے کے وقفے سے دونوں کبوتر رات کو کئی بار جاگے مگر ایک دوسرے کے آرام کی خاطر زیادہ ہلے جلے نہیں۔ اب کے کالے کبوتر کی آنکھ کھلی تو صبح کے ستارے کی روشنی اس کی پتلیوں کے پانی میں جھلملا گئی۔ اس نے پنجوں کو باری باری کھول کر اور گردن کو ادھر ادھر گھما کر سستی دور کی۔ اس نے محسوس کیا کہ بیٹھے بیٹھے اس کے پروں کے پٹھے سو گئے ہیں، اس نے ان کو دو تین بار پورا کھولا اور بڑی شاخ پر بیٹھ کر صبح کے ستارے کو دیکھنے لگا۔ اس ستارے سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ کوئی نہ کوئی قدر مشترک ہو تو دوستی ہو ہی جاتی ہے۔ ستارے اور کبوتر میں روشنی مشترک قدر تھی۔ ایک روشنی کا دیوتا تھا تو دوسرا روشنی کا پرستار۔ ستارے کو دیکھ کر اسے سورج کی یاد آ گئی [illegible] دیکھے ایک مدت ہوگئی تھی۔ اب تو اسے صحیح طور پر یاد بھی نہیں رہا تھا کہ سورج کی روشنی کتنی شفاف ہوتی ہے۔ وہ ابھی ان خیالوں میں گم تھا کہ کبوتری کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پنجوں سے انڈوں کو کروٹ دی اور کبوتر کی طرف دیکھ کر بولی کیا سوچ رہے ہو؟ کبوتر نے

کچھ لمحے توقف کیا اور پھر بولا! سوچ رہا ہوں روشنی سے محبت کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ جسے اس سے عشق ہو جائے وہ اس سے دور رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کبھی اسے صبح کے ستارے میں تلاش کرتا ہے تو کبھی سورج کی امید پر دل بہلاتا ہے۔ کبھی دیس بدیس کی ہوا پھانکنی پڑتی ہے تو کبھی پہلی جھولی کے انڈوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ ہاں! یاد آیا صبح انڈے جلدی خاکی کبوتری کے پروں تلے دے دینا تاکہ ہم لوگ یکسوئی سے اپنے سفر کی تیاری کرسکیں۔ اب صبح قریب تھی۔ آسماں پر ستارے مدھم ہونے لگے تھے مگر اس کے ساتھ ہی کوؤں کے گہرے کالے بادل چھانا شروع ہوگئے تھے۔ ننھی چڑیوں کی چہچہاہٹ اور ننھے پرندوں کے میٹھے گیت کائیں کائیں میں دب گئے۔ پھر پتہ نہیں کب سورج نکلا اور کیسا نکلا۔ ہر طرف کوؤں کی دلخراش آوازیں پھیل گئیں۔ چار سو پریشر ہارن اور کالے کڑوے دھوئیں کی کیفیت غالب آ گئی۔ کافی عرصے سے جنگل کے دن اور راتیں ایک جیسی تھیں مگر پرندوں کی سوچ میں اب واضح تبدیلی واقع ہوئی تھی اور وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تگ و دو میں مصروف تھے۔

اگلا پورا دن سفید کبوتری اور کالا کبوتر ٹیبل ورک مکمل کرتے رہے۔ ان کی دانست میں انسان کی موجودہ تفریق اور تخصیص کی سب سے بڑی وجہ قومیت پرستی کا جذبہ تھا جسے وہ کوؤں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتے تھے۔ وطینت پرستی کا اژدھے انسانی بستیوں میں منہ کھولے بیٹھا تھا اور ڈرے ہوئے انسان مذہب، معاشرت، معاشیات، ادب، تعلیم، ثقافت، تمدن، سیاست، خون، رنگ، نسل، زبان، جنسی جبلت، قانون، انصاف، زن، زر اور زمین کے کلہاڑوں سے دوسرے انسانوں کو کاٹ کاٹ کر اس کے منہ میں ڈالتے جاتے تھے۔ چونکہ ان جذبوں اور طریقوں کو کوؤں میں پہلی دفعہ متعارف کروانا مقصود تھا لہٰذا انسانی تاریخ کے آغاز اور وقت کے ساتھ اس کی درجہ بدرجہ اشکال سے آگاہ

ہونا بہت ضروری تھا۔ تاریخی حوالوں سے دونوں کبوتروں کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ غیر محتاط اندازے کے مطابق بگ بینگ کا واقعہ دس ہزار سے لیکر بیس ہزار ملین سال پیشتر رونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس حادثے کے ہزار ہا سال بعد ہی زمین پر کسی مخلوق کا ظہور ممکن ہوا ہوگا۔ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب تو شاید خود انسان کے پاس بھی نہیں تھا کہ اس سیارے پر اس کی زندگی کا آغاز کس طرح ہوا۔ کبوتروں کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ ہی انہیں ضرورت تھی کہ وہ اس بارے قیاس آرا ہوں کہ انڈا پہلے بنایا مرغی۔ انہیں تو اس بات سے دلچسپی تھی کہ انسان جب بن چکا تو اس نے بنے بنائے کو کس طرح بگاڑا۔ تمام تر اختلافات کے باوجود یہ بات تو اب کچھ نہ کچھ تسلیم شدہ ہی تھی کہ انسان کے اولیں تمدن کے سوتے مشرق وسطیٰ اور صحرائے گوبی کے علاقے سے پھوٹے۔ ایک عرصہ درندوں ایسی زندگی گزارنے کے بعد جب انسان نے یورپ، شام اور پھر دجلہ وفرات کا رخ کیا تو یہاں کے سبزے اور پانی نے انہیں ان جانوروں کو پالنے کی ترغیب دی جنہیں پہلے وہ کچا کھا جایا کرتا تھا۔ اب جو اس مخلوق کو کر ذرا سکھ کی سانس نصیب ہوئی تو اس نے سوچنا شروع کردیا۔ یہی سوچ اس کی پہلی تفریق اور آخری تخصیص کا باعث ثابت ہوئی۔ انسان ہی کی طرح زمین پر اس کی سوچ بھی بہت دیر پا ثابت ہوئی۔ پھر تو وہ جنگلوں کو کاٹتا، پہاڑوں کو توڑتا اور دریاؤں کو چیرتا جس جزیرے یا خشکی کے جس خطے میں بھی گیا اس کی سوچ اس کے ساتھ رہی۔ طاقتور لوگوں کی سوچ تو کمزوروں کے جانوروں اور پودوں پر ہاتھ صاف کرنے تک محدود رہی مگر کمزور لوگوں نے چاروناچار عقل وشعور سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو سورج، چاند، ستاروں، جانوروں، پہاڑوں اور درختوں سے ڈرانا شروع کردیا۔ یہیں سے انسان کے اعتقاد کی بنیاد پڑی اور مائتھالوجی کا آغاز ہوا۔

ابھی تک اشارے کی زبان چلتی تھی اور الفاظ ایجاد نہ ہوئے تھے۔ الفاظ کی

ایجاد سے پہلے علم الاشکال رائج ہوا، جن لوگوں کا دیوتا سورج تھا ان کا نشان سورج تھا۔ پھر کسی کاہن نے سورج کی تصویر کو پتھر پر بنایا تو مورتیوں کی بنیاد پڑی۔ مزید کچھ عرصے بعد کام اور ضرورت کی نسبت بہت سی چیزوں اور جانوروں کو کچھ مشترکہ آوازوں سے پہچانا جانے لگا اور یہ آوازیں الفاظ کی تشکیل کا باعث بنیں۔ اب طاقت دو طرح کے لوگوں کے پاس تھی۔ ایک وہ جو واقعی طاقتور تھے اور اسی بنیاد پر دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا سکتے تھے اور دوسرے وہ جو لوگوں کو اعتقادات کی بنیاد پر لوگوں کو ہراساں کر کے اپنے ہمنوا بنانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان دونوں طاقتوں کے ایماء پر لوگوں نے جانوروں کو بچانے اور ان کی تعداد بڑھانے کے لیے زراعت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ کوئی طاقتور یا کاہن جس کے پاس جانور ہوتے تھے وہ انہیں دوسروں کو دے دیتا تھا اور بدلے میں دو کے چار اور چار کے آٹھ وصول کرتا تھا۔ اس طرح انسانی معیشت کی بنیاد پڑی جو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اب بھی من و عن رائج ہے۔ کبوتروں کو معلومات ترتیب دینے اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں دو دن لگ گئے۔ تیسرے دن صبح ہی سے کالا کبوتر اور سفید کبوتری سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ کبوتری اپنے پنجے شاخوں سے رگڑ رگڑ کر مانجھ رہی تھی اور کبوتر اس کی دم کے زائد بالوں کو کھینچ کر دم کو ہموار کر رہا تھا۔ کبوتر کبوتری سے کہنے لگا، تم اپنی لمبی دم کو زمین پر گھسیٹ کے مت چلنا، انسانی بستیوں میں جگہ جگہ گند بکھرا ہوتا ہے، ایسا نہ ہو تمہاری دم گندی ہو جائے اور اس کے شہ پر کمزور پڑ جائیں۔ دم کا خیال آتے ہی کبوتر کو شرارت سوجھی اور وہ کہنے لگا، دم سے دم ملاؤ گی! کبوتری نے چونچ مار کر اسے خود سے دور ہٹایا اور کہنے لگی، پتہ ہے مہان کبوتر نے مہم کے دوران دم ملانے سے منع کیا ہے، دم ہی نہیں بلکہ چونچ ملانے سے بھی منع کیا ہے۔ کبوتر دو تین پنجے بدل کر اس کے قریب آیا اور بولا میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ کبوتری فکر مند ہو کر بولی، مذاق چھوڑو اور یہ سوچو کہ انسان پرندوں

کو کھا بھی جاتے ہیں۔ میں تو سوچتی ہوں ہمارے جنگل میں بھی انسان آ جائیں اور سارے کوؤں کو کھا جائیں۔ کبوتر بولا پگلی انسان سارے پرندوں کو نہیں کھاتے اور کوّے بھی ان خوش قسمت پرندوں میں شامل ہیں جنہیں بہت کم انسان کھاتے ہیں۔ البتہ کبوتروں کو سارے انسان کھاتے ہیں مگر تم اس کی فکر نہ کرو۔ مہان کبوتر نے تمہارے پروں سے مشابہہ وائٹ ہاؤس کے نمائندوں سے ہماری آزادی اور حفاظت کی گارنٹی حاصل کر لی ہے۔ اس کام کے بدلے تمام کبوتر اپنی تین سال کی بیٹیں پاپا کی فیکٹری کے لیے دیں گے۔ پتہ ہے وہ لوگ ان بیٹوں کا کیا کریں گے! وہ لوگ ان بیٹوں سے نشہ کشید کر کے تیسری دنیا کو چوتھی اور پھر پانچویں دنیا میں تبدیل کرنے کے گھناؤنے خواب دیکھ رہے ہیں۔ پر ہمیں کیا، ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے اور بس۔ دونوں کبوتر ہرے پانی والی ندی میں نہائے اور ریت پر بیٹھ کر انہوں نے اپنے پر سکھائے۔ شام ہوئی تو وہ دونوں مہان کبوتر کی خدمت میں اشیرباد کے لیے حاضر ہوئے۔ مہان کبوتر نے انہیں بتایا کہ وہ مشرق تا مغرب انسانی بستیوں کا سفر کریں گے اور ضرورت کے تحت شمال اور جنوب کے علاقوں کو ساتھ ملاتے ہوئے انسانی زندگی کے ناسوروں کا مشاہدہ کریں گے اور کوؤں کی بدبختی کا سورج تلاش لائیں گے جو کبوتروں کی خوشحالی کا سورج بھی ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب رہے تو کبوتروں کی آئندہ نسلوں میں ان کی یادگار بوذر، مارکس اور لینن سے کم نہیں ہوگی۔ دونوں کبوتروں نے مہان کبوتر سے اجازت لی اور رات کے اندھیرے میں جب پریشر ہارن اور کالے، کڑوے دھوئیں کی کیفیت میں ذرا کمی واقع ہوئی تو انہوں نے اپنی مہم جو اڑان کا آغاز کیا۔

کئی دن سفر کے بعد دونوں کبوتر پوئی جھیل کے کنارے ایک مندر کے گنبد پر آ بیٹھے۔ گنبد کا پیٹ ڈھلوان اور چکنا ہونے کی وجہ سے وہ بار بار نیچے کو پھسل رہے تھے۔ کبوتری نے کچھ دیر تو پنجے جمانے کی کوشش کی مگر وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ کبوتر

بھی سنبھلتے سنبھلتے عاجز آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کوئی بات کرتے، کبوتری ادھر ادھر مشتاق نگاہوں سے دیکھتی ہوا میں تھوڑی دیر اڑی اور اینٹوں کے بنے چھوٹے سے خانے میں بیٹھ گئی۔ کبوتر بھی اڑا اور کبوتری کے خانے میں جگہ نہ پا کر ساتھ والے خانے میں اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں کے بیچ نمونے کے مطابق آگے کو بڑھی ہوئی ایک اینٹ پڑتی تھی۔ دونوں کبوتر بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے چپ چاپ کئی گھنٹے تک اپنی گردنیں پیچھے کی طرف ڈھیلی چھوڑ کر ستاتے رہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، ہر طرف سناٹا طاری تھا اور شہر کی روشنیاں جھیل کے پانی میں جھلملا رہی تھیں۔ دونوں کبوتر اب تازہ دم ہوگئے تھے۔ کبوتری کہنے لگی میں سوچتی ہوں یہ گنبد تو گھونسلہ بنانے اور انڈے سینے کے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ کبوتری کی بات سن کر کبوتر نے قہقہہ لگایا اور بولا، پگلی ہم یہاں انڈے سینے نہیں بلکہ کبوتروں کو بچانے آئے ہیں۔ کبوتری ایک دم جیسے نادم ہوگئی اور بولی، میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اب یہ بتاؤ کیا پروگرام ہے۔ کبوتر بولا، میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہمیں اپنے کام سے متعلق کچھ تبادلہ خیال کر لینا چاہئے۔ جیسا کہ میں زمین پر انسانی مخلوق کے آغاز کا ذکر کرچکا ہوں۔ اب میں انسانی زندگی کے آغاز کے بعد اس تفریق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنی بہت سی جدید صورتوں کے ساتھ آج بھی انسانی معاشرے کا خاصہ ہے۔ زرعی انقلاب کے بعد انسانوں کے دو واضع گروہ تشکیل پا گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو طاقتور تھا اور اپنی قوت کے بل بوتے پر دوسروں کے حصے کی خوراک اور زمین کے زرخیز قطعات پر قابض ہوگیا۔ بہت سے کمزور لوگ اس گروہ کے ہاتھ مضبوط کرنے پر کمر بستہ ہوگئے۔ جاگیر اور املاک کے خیال نے نمو پائی اور پنپتا چلا گیا۔ یہ گروہ اب تک جاگیردارانہ نظام کی نمائندگی کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس گروہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر کمزور لوگوں نے سوچ کا سہارا لیا اور لوگوں کو دیکھی ان دیکھی مصیبتوں اور بلاؤں کے نام پر ڈرانا شروع کردیا۔

بنیادی طور پر تو یہ گروہ استحصالی معاشرے کی پیداوار تھا مگر بعد میں مائتھالوجی سے متعلق اعتقادات اتنے پکے ہو گئے کہ انسان چاہے بھی تو ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔ انسان نے جس چیز کو خود سے طاقتور، بڑا یا دور محسوس کیا یا جو چیز اس کے رنج اور راحت کا سبب بنی اس نے اسے اپنی پوجا پاٹھ کا مرکز بنالیا۔ اس دوران جو مذہبی گروہ وجود میں آیا اس کی اساس زرخیزی اور ثمر آوری پر مبنی تھی۔ جہاں بارش اور زمین کے دیوتا اور دیوی کی پرستش عمل میں آئی وہاں زمین میں ہل چلانے اور فصلیں پیدا کرنے سے مماثلث کی بنا پر جنسی عمل کو بیش بہا اہمیت حاصل ہوئی۔

کبوتر نے کچھ لمحے توقف کیا اور کبوتری سے کہنے لگا، تمہیں پتہ ہے ایک وقت عورت حکمران اور مرد اس کا غلام ہوا کرتا تھا۔ کبوتری نے حیرت سے کبوتر کو دیکھا جیسے اس کے لیے یہ کسی اچنبے کی بات ہو۔ کبوتر نے اس کے تجسس کو بھانپتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ انسانی معاشرے کے آغاز میں مادری نظام رائج تھا۔ عورت کو مقدس دیوی کی حیثیت حاصل تھی۔ مرد اس کی خدمت اور پوجا پر مامور تھا۔ قدیم مصر اور موہنجوداڑو کی تہذیبیں عورت کی اس امتیازی حیثیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ تہذیب کہ موجودہ دور میں جس کے بارے سوچنا دشوار لگتا ہے، آج بھی افریقی قبائل میں من وعن موجود اور جاری و ساری ہے۔ زرعی معاشرے کے استحکام کے ساتھ ریاست کی بنیاد پڑی اور ریاست کے تصور نے عورت کی حیثیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ریاست کا تصور چونکہ استحصال، جبر اور طاقت کے استعمال پر بنیاد کرتا تھا اس لیے پدری نظام معاشرہ کی بنیاد پڑی اور آہستہ آہستہ عورت کا مقام جائیداد ایسا ہوگیا اور اس کا شمار بھیڑ بکریوں اور گائے بھینسوں کے ساتھ ہونے لگا۔ اس کشمکش کے بعد انسانوں کے درمیان ایک تیسری تفریق نے جنم لیا۔ یہ تفریق تھی مرد اور عورت کی تفریق۔ حیرت کی بات ہے کہ انسانی تاریخ کے اوزاق پر اس سرد

جنگ سے متعلق بہت کم عبارت تحریر ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جدید معاشرے کے پیدا کردہ دیگر مسائل سے الجھاؤ کے دوران اس غیر محسوس خطرے پر زیادہ توجہ نہ دی جاسکی ہو۔

کبوتر تھوڑی دیر چپ ہوا تو کبوتری بولی، انسانوں کے ایک بنیادی اور چوتھے گروہ کی طرف تو تم نے اشارہ ہی نہیں کیا۔ یہ گروہ ہے سرمایہ دار گروہ، سرمایہ دارانہ نظام معاشرہ کا نمائندہ گروپ۔ یہ گروہ بذات خود انسانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اوران کے انتشار اوران کے اقتصادی بحران اور اخلاقی انحطاط کا ذمہ دار ہے۔ جب ہم انسانوں میں انتشار کی وجوہات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو میرے خیال میں انسانوں کی اس کلاس کا پوسٹ مارٹم بھی بہت ضروری ہے۔ کبوتر بولا، تم ٹھیک کہتی ہو، ہمارے مطالعے اورمشاہدے کی رو سے اس گروہ کے عادات وخصائل کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ یہ گروہ چونکہ انسانی معاشرے کے آغاز کے بہت بعد وجود میں آیا یعنی باقاعدہ طور پر فرانس کے انقلاب کے بعد اس لیے سردست میں نے تم سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال ہم اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں اور مذاہب سے متعلق انسانی اعتقادات، روایات، عملی پہلوؤں، تاریخی پس منظر اور فوائد ونقصانات کا جائزہ لیں گے۔ بس اب تم سنتی جاؤ، دیکھتی جاؤ، محسوس کرتی جاؤ اور سمجھتی جاؤ۔

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ سحری کا ستارہ پورے جوبن پر تھا۔ کبوتر تو پہلے ہی جاگ رہے تھے اور اب مندر کی گھنٹیوں کی آواز سن کر انسان بھی بیدار ہونے لگے تھے۔ اشنان کے بعد پجاری نے جلدی جلدی اپنی دھوتی کے پھیر درست کیے، ایک جوگیہ رنگ کی چادر کندھے پر ڈالی اور ماتھے پر سندور پوت کر ہری اوم اور اوم نمشوائے کا ورد کرتے ہوئے مورتیوں کو جھاڑنے پونچھنے لگا۔ کبوتروں نے بیٹھے بیٹھے پورے پر کھول کر سستی دور کی اور بستی کے لوگوں کا جائزہ لینے کے لیے اڑ

کر پیپل کے ایک درخت پر جا بیٹھے۔ یہ کسی برہمن کا گھر تھا اور برہمنی ہاتھ میں گاؤ ماتا کا گوبر اٹھائے آ رہی تھی۔ اس نے پیپل تلے کھانا پکانے کے چوکے پر پانی ملے پتلے گوبر کا لیپ کیا اوراندر برتن اٹھانے چلی گئی۔ جیسے ہی وہ اندر گئی، باہر کے دروازے کے پیچھے چھپے ایک شرارتی بچے نے دروازے کی اوٹ سے اپنا سر باہر نکالا اور ادھر ادھر دیکھ کر بھاگتا ہوا آیا اور چوکے پر اپنے پاؤں کے دو تین نشان بنا کر بھاگ گیا۔ برہمنی واپس آئی تو چوکے پر پاؤں کے نشان دیکھ کر تلملا اٹھی۔ جی بھر کر اس نے بستی کے بدمعاش مسلوں کو گالیاں دیں اور نئے سرے سے گائے کا گوبر پوچنے لگی۔ کبوتری نے حیرت سے کبوتر کی طرف دیکھا تو وہ بولا ہندو مذہب کے پجاری کھانا پکانے سے پہلے جگہ کو گائے کے گوبر سے پاک کرتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے مذہب کا شخص یا کسی نچلی ذات کا ہندو ان کے چوکے کے پاس سے گزر جائے تو ان کی دانست میں کھانا پکانے کی جگہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ مالک نے انسان کو صرف اس لیے اشرف المخلوقات بنایا کہ وہ فکر کرتا ہے، سوچتا ہے، اس کے پاس عقل ہے اور وہ عمل کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ اس نے یہ کائنات بنائی اور اس میں بہت سے بھید چھپائے اور اب وہ انسان سے اس بات کی توقع کرتا ہے کہ انسان ظن وتخمیں سے نہیں بلکہ سائنسی بنیادوں پر کائنات کو تسخیر کرے۔ خالق یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان انسان سے محبت کرے کیونکہ وہ خود بھی اپنی مخلوقات سے بہت پیار کرتا ہے۔ انہیں چند باتوں میں انسان کے اس سوال کا جواب بھی موجود ہے جو وہ اکثر اپنی تخلیق کے بارے پوچھتا یا سوچتا نظر آتا ہے۔ انسان کا سب سے پہلا منصب تو یہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور غور فکر کو دماغ میں جگہ دے۔ انسان کا دوسرا منصب یہ ہے کہ وہ عمیق مشاہدے اور ٹھوس تجربے کے ذریعے اپنے گرد پھیلے اسرار و رموز کو افشا کرے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشاہدے اور تجربے کی کڑی کسوٹی سے گزر کر ہی کیوں کائنات کا علم حاصل کیا

جائے جبکہ انسان نے اندازے اور قیافے کی بنیاد پر نا قابل یقین حد تک کامیابی حاصل کی۔ سیدھی سی بات ہے کہ بنانے والا بھٹکانے کی کبھی نہیں سوچتا۔ ظن اور قیافے سے حاصل کیا گیا علم نہ تو انسان کے لیے دیرپا ہوسکتا ہے اور نہ مفید۔ انسان کا تیسرا بڑا منصب یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے محبت کرے۔ انسان کی تخلیق کے تینوں مقاصد دراصل ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ کوئی بھی انسانی مذہب یا اخلاقیات انہیں تین رہنما اصولوں پر بنیاد کرتے ہیں۔ بعد میں انسان ان اصولوں کا سہارا لیکر اور اپنے ڈر اور اپنی خواہش کو مذہب کا نام دے کر اخلاقیات کو کس کس طرح سے پامال کرتا ہے، کیا کیا تاویلیں ڈھونڈتا ہے اور کیا کیا جواز فراہم کرتا ہے اس کا ایک مظاہرہ تو تم دیکھ چکی ہو کہ جانور کا گوبر پاک اور انسان کا قدم منحوس۔

کبوتر اپنی بات مکمل کر چکا تو کبوتری بولی، میں نے اس دھرم کے بارے کچھ معلومات اکٹھی کی ہیں۔ یہ دھرم کوؤں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سوچ کا عمل دخل بہت ہی کم بلکہ یوں کہو کہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ جہاں سوچ کی صبح طلوع ہو وہاں شعور کے سورج کی کرنیں نمودار ہوتی ہیں۔ جہاں شعور کی روشنی ہوتی ہے وہاں جہالت کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ اگر جہالت کا اندھیرا چھٹ جائے تو پھر انسان ایسی عقلمند مخلوق کو ذات پات اور اونچ نیچ کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ یہاں ہو رہا ہے، برہمن کے گھر پیدا ہونے والا برہمن اور شودر کے گھر پیدا ہونے والا شودر بن کر جیتا اور مرتا ہے۔ انسان کا کام چھوٹا بڑا یا برا بھلا ہوسکتا ہے مگر انسان صرف انسان ہوتا ہے۔ مگر یہ بات ان لوگوں کو کون سمجھائے۔ چھوٹے بڑے اور امیر غریب کی تفریق پر تو ہم کبوتروں کا جی بھر آتا ہے، پتہ نہیں انسان کا دل کیوں نہیں پسیجتا۔ کسی بھی نظام معاشرہ کی تشکیل میں انصاف خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ کائنات کا سارا

نظام عدل پر مبنی ہے۔ پھول، پھل، پتے، شاخیں، گھاس، موسم، بادل، بارش، پرندے اور جانور سب کے سب فطرت پرست ہیں۔ انسان کے سوا دنیا کی تمام مخلوقات و نباتات قدرت کے قانون کی سخت پابند ہیں۔ جانور اپنی جنسی تحریک کے لیے مخصوص موقت اور جبلت کے لیے اص نوع تک محدود ہیں۔ خدا کے حساب سے تو انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے جبکہ انسان نے اپنے نصیب کی گیتا میں وہ کچھ درج کرلیا ہے کہ جس کے لیے نہ تو اسے کوشش کرنی پڑتی ہے اور نہ وہ اس کا اہل ہوتا ہے۔ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہو۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے بغیر محنت کے سب کچھ بیٹھے بٹھائے مل جائے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کی محتاج اور غلام ہو۔ یہی نہیں، وہ تو اس حد تک ہوس پرست ہے کہ اپنی آنے والی نسلوں کی حیثیت کے بارے میں بھی اخلاقی و معاشرتی طور پر اس کا اہتمام کرنے کے درپے رہتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے کہ برہمن کے بیٹے اجلے لباس پہن کر وقت گزاری کے لیے چلے کاٹنے اور دیوداسیوں سے کھیلنے کے لیے پیدا ہوں اور شودر ان کی گندگی اٹھانے اور ان کو مارکھانے کے لیے دنیا میں آتے رہیں۔ یہ کیسا اخلاق ہے کہ ویش اپنی تجوریاں بھرتے رہیں اور کھشتری خون پسینہ ایک کرتے رہیں۔ ایسا نظام، ایسا معاشرہ، ایسا مذہب اور ایسا اخلاق چیونٹیوں، شہد کی مکھیوں، دیمک اور بھڑوں کو تو زیبا ہے مگر انسان ایسی سوچنے اور محسوس کرنے والی مخلوق کو نہیں۔

کبوتری نے اپنی بات ختم کی اور موٹے ٹہنے پر پنجے اکٹھے کر کے پیٹ کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے جسم کے پروں کو پھلایا اور انہیں کرید کر پتوں کی اوٹ سے چم چماتی سورج کی کرنوں کی حرارت کو اپنی جلد میں جذب کرنے لگی۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور پیپل کے پتے ٹپ ٹپ تالیاں پیٹ رہے تھے۔ بدلتی رت کے دوش پر کبوتر کے خون نے جوش مارا اور وہ کبوتری کے قریب آ گیا۔ اس

نے دفعتاً کبوتری کی چونچ میں اپنی چونچ ڈال دی اور کچھ لمحے اس کی گردن میں گردن ڈال کر بیٹھا رہا۔ چونچ سے چونچ کے لمس نے لہو کو مزید جوش دیا اور وہ توازن برقرار رکھتے ہوئے کبوتری کے اوپر آ بیٹھا۔ ابھی وہ اپنی دم کو نیچے لانے لگا تھا کہ کبوتری ایک طرف ہوگئی۔ کبوتر نے ایک اور کوشش کی مگر اس بار کبوتری نے اسے اپنی کمر پر پنجے نہ رکھنے دیئے۔ کبوتر تو شاید پھر کوشش کرتا مگر کبوتری نے اسے آج کی اسائنمنٹ یاد دلائی اور بتایا کہ ہم یہاں کس کام سے آئے ہیں۔ اگلے ہی لمحے کبوتر سنجیدہ ہوگیا اور بولا چلو واپس جا کر گنبد پر دھوپ سینکتے ہیں۔ ابھی وہ مندر سے تھوڑا دور ہی تھے کہ انہوں نے دیکھا کچھ لوگ مقدس کتابیں سروں پر اٹھائے احتجاج کررہے ہیں۔ کچھ لوگ بھالے برچھیاں اٹھائے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور غصے سے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اب سارے لوگ ایک گھر کے گرد جمع تھے۔ کچھ نے دروازہ توڑ دیا تھا تو کچھ دیوار پھلانگ کر صحن میں کود گئے تھے۔ کچھ لوگ ایک آدمی کو ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لے آئے تھے اور اینٹوں اور ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ پٹنے والے آدمی کے منہ اور ناک سے بری طرح خون بہہ رہا تھا اور وہ گل گھوٹو والے جانور کی طرح سانس کھینچ رہا تھا۔ کسی برچھی والے کو جگہ ملی تو اس نے سینے میں برچھی چلا کر کام ہی تمام کردیا۔ کچھ لوگ تو مرنے والے کے جسم میں برچھیاں چبھو کر اور بھالے پرو کر شانت ہوگئے تھے اور جو پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے مٹی کا تیل چھڑکنے کے بعد مردے کو آگ لگا کر اپنا غصہ کم کیا۔ ہارن بجے، سینا آئی اور مردے کے ٹکڑے اکٹھے کر کے لے گئی۔ سینا ازخود ڈری ہوئی تھی اس لیے نہ کسی سے کچھ پوچھا گیا اور نہ کسی کو پکڑا گیا۔ سب کچھ اتنا اچانک اور اتنا برا ہوا تھا کہ کبوتر پریشان ہوگئے اور مندر کے صدر دروازے پر آ بیٹھے۔ اب بھی کافی لوگ مندر کے اندر باہر موجود تھے۔ بہت سے لوگ اس واقعے کے بارے مزید جاننے کے لیے بے چین تھے۔ پنڈت جی اپنے قریب

لوگوں کو اور پھر یہ لوگ دوسرے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ ایک پاگل نیچ مندر کے اندر گھس آیا تھا۔ یہی نہیں اس نجس نے پوتر کتاب کو چھو کر اور بھگوان کو ہاتھ لگا کر ان کا اپمان بھی کیا۔ وہ تو رام نے غیبی مدد کی جو پجاری جی دیوان خانے سے باہر نکل آئے۔ ان کے شور پر رام کے نام لیوا پہنچ گئے اور دوشی کو نرگ رسید کیا۔ لوگ رام رام کرتے، کانوں کو ہاتھ لگاتے مندر کے درودیوار کو گلاب کے عرق سے دھونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ دونوں کبوتر دلگیر ہوئے بیٹھے تھے، وہ تو پہلے ہی کوؤں کے ظلم دیکھ چکے تھے اور اب انسان کا رویہ ان کے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف تھا۔ کبوتری کہنے لگی کہ اگر ایک فاتر العقل شخص مندر میں گھس آیا تھا تو کوئی قیامت تو نہیں آ گئی تھی۔ نہ اس کے چھونے سے مورت میلی ہوئی تھی اور نہ کتاب کی زینت پر کوئی حرف آیا تھا۔ انسان چاہے تو لاکھوں بت بنا سکتا ہے، کروڑوں کتابیں چھاپ سکتا ہے مگر مرے ہوئے پاگل کو کبھی زندہ نہیں کر سکتا۔ ایسی پوجا کا کیا مطلب، ایسی عقیدت کے کیا معنی اور ایسی کتاب کی حرمت کی کیا وقعت جو انسان کو انسان سے جلاد بنا دے اور اسے بے رحم اور سنگدل کر دے۔ قتل ہونے والا جو بھی تھا اور جیسا بھی تھا مگر انسان تھا، تو پھر اسے کیوں مارا گیا؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب شاید اسے قتل کرنے والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔ کبوتر کو اس کی مزید تحقیق کی ضرورت نہیں تھی، وہ تو مشن کے تحت آئے تھے اور کبوتر اپنے مشاہدات کو اپنی یادداشت میں فیڈ کر کے اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔

کچھ دن بعد کبوتروں نے فیصلہ کیا کہ انہیں دور دراز کے دیہات میں جانا چاہئے تا کہ ان کے مشاہدے کو مزید تقویت ملے۔ وہ ہریانہ کے ایک گاؤں رام پور میں چلے گئے۔ وہ چاہتے تو یہاں بھی مندر پر جا بیٹھتے مگر مندر کی عمارت ایک منزلہ تھی اور گنبد بھی زیادہ اونچا نہیں تھا اس لیے انہوں نے ٹھاکر رام داس کی حویلی کے چوبارے پر بسیرا کیا۔ رام داس اس گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ گاؤں کی آبادی

زیادہ نہیں تھی اور ڈیڑھ دوسو گھر یہاں آباد تھے جس میں زیادہ تر نچلی ذات کے ہندو تھے۔ گاؤں کے سب لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور رام داس کے مزارع تھے۔ رام داس کے آباؤ اجداد کا تعلق مغربی پنجاب سے تھا اور تقسیم کے بعد ان کو یہاں زمین الاٹ ہوئی تھی۔ کبوتروں نے دیکھا کہ شہر کی نسبت پس ماندہ علاقوں میں چھوت چھات کی صورت حال اور بھی گھمبیر تر تھی۔ حویلی کے ساتھ ہی مویشیوں کا باڑہ تھا۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کی زیادہ تر ذمے داری چندر پر تھی۔ چندر رنگ کا تو کالا تھا مگر تھا بہت تگڑا، چوڑا سینہ، موٹے موٹے بازو، لمبا قد اور گھنیری مونچھیں۔ کامنی رام داس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ سب سے بڑی تھی اور باقی تین بھائی اس سے کئی سال چھوٹے تھے۔ اب تو وہ تیس سال کی ہو چلی تھی مگر جائیداد کے بٹوارے کے خوف سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھار جب کوئی فطری جذبہ اس کے دل میں مچلتا تو وہ چوری چھپے چندر کے مضبوط جسم کا دیدار کر لیتی۔ وہ قریب سے بھی چندر کو دیکھ لیتی تھی کیونکہ گھر میں پردے کا رواج تو تھا نہیں اور چندر صبح شام دودھ کی گاگر بھی اسے ہی لا کر دیتا تھا۔ کبوتروں نے دیکھا کہ آج بھی وہ دوپہر کے وقت چوبارے کی کھڑکی سے چندر کو چولہے کے لیے لکڑیاں کاٹتے دیکھ رہی تھی کہ کیکر کے کانٹوں میں الجھ کر سامنے سے چندر کی دھوتی سرک گئی اور وہ زیرِ لب مسکراتی ہوئی دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے پلنگ پر آ گری۔ شام کو جب وہ اس سے دودھ لینے لگی تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ انسان کہی ہوئی بات سے مکر سکتا ہے، سنے ہوئے الفاظ کو بھول سکتا ہے، لکھئے ہوئے گیان سے انحراف کر سکتا ہے مگر جذبات کی زبان کو ہر عمر اور ہر سطح پر محسوس کر سکتا ہے۔ احساس کی اسی آنکھ مچولی کے دوران کئی دن بیت گئے۔ ان دونوں کے بیچ اونچ نیچ کی دیوار کے سوا اب کچھ حائل نہیں تھا۔ جذبات کے آگے تو یہ دیوار ریت کی دیوار ہی ثابت ہوئی۔ یوں تو چندر بہت ڈرتا تھا مگر اسے کامنی کی شہہ حاصل تھی۔ عورت اگر چاہے

تو کوئی بھی مرد کسی بھی طرح کا تعلق قائم کر سکتا ہے۔ یہاں جو تعلق قائم ہوا وہ خاص کر نفسانی تھا۔ اسے کسی بھی طور عشق و محبت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عشق اگر چہ جنسی جبلت کا زائیدہ ہے مگر اس کے پیرا یہ اظہار کے لیے خاص انسانی شائستگی اور تہذیب کی ضرورت ہوتی ہے جو یہاں مفقود تھی۔ اونچی ذات اور اجلی پوشاک والی کو ایک رات پچھواڑے میں روڑی پر ہی گرا لیا گیا۔ دو تین دن تو میٹھے درد کے نشے میں گزر گئے مگر اس کے بعد کامنی کو فکر لاحق ہوگئی۔ جو فکر بھی ہونی تھی وہ کامنی ہی کو ہونی تھی کیونکہ چندر تو فکر کے مفہوم سے آگاہ ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے ٹھاکر کو فتح کر لیا تھا اور اس کی عزت روڑی میں ملا دی تھی۔ کامنی کے تمام خدشات اپنی جگہ بجا تھے مگر اس نشے کے آگے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ ابھی پہلا نشہ اترتا نہیں تھا کہ دوسرے کی پڑ جاتی تھی۔ بہت برا نشہ ہے یہ نشہ بھی۔ یا تو کوئی اس نشے سے متعارف ہی نہ ہو کہ جب لڑکے لڑکیاں کنوارے ہوتے ہیں تو انہیں اس کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس طرح بہت سے لوگ کنوارے کے کنوارے ہی مر جاتے ہیں۔ جب کوئی اس پھل کو چکھ لیتا ہے تو پھر وہ کبھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا چاہے اس کے لیے اسے آدم کی طرح دنیا کی جنت سے ہی کیوں نہ نکلنا پڑے۔ کچھ نہیں ہوگا اور کچھ ہو جائے گا کی مصیبت کے دوران کامنی کے دو ماہ بیت گئے۔ اس کی ناف کے تلے بنی ہوئی گیند ذرا بڑی ہونے لگی تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ ڈر سے اس کے ہونٹ خشک اور چہرہ پیلا پڑ گیا۔ تنگ آ کر اس نے ماں کو سب کچھ بتا دیا۔ ماں کے تو جیسے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ روئی، جھنجھلائی، کامنی کو کوستی رہی مگر اس کے علاوہ وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ چھوہارے، کشمش، کاجو سب کھلا کر دیکھ لیے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ چوری چوری دایا سے مشورہ کیا تو اس نے بھی معذوری کا اظہار کیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جو ہونے والا تھا اسے ہونے دیا

جائے۔

کافی عرصہ دونوں کبوتر گاؤں در گاؤں اور شہر در شہر اڑتے اور قیام کرتے رہے۔ اس دوران ایک اور واقعے نے ان کے دل دہلا دیئے۔ آندھرا پردیش کے ایک گاؤں میں گردن توڑ بخار سے شادی کے تیسرے دن ایک جوان کی موت واقع ہوگئی۔ مرنے والے کے گھر والوں نے اس بدقسمتی کی ساری ذمہ داری دولہن پر ڈالدی۔

ساس کہہ رہی تھی کہ بہو منحوس ہے جو گھر میں آتے ہی اس کے بیٹے کو کھا گئی۔ بہنیں بھاوج کو چھبیاں دے دے کر مورد الزام ٹھہرا رہی تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے کچی کھا جائیں۔ بیچاری دولہن ایک کونے میں سہمی بیٹھی تھی۔ اسے اتنی اجازت بھی نہیں تھی کہ وہ رو سکے۔ اگر وہ روتی تو اسے وہاں پر موجود لوگ منحوس ہونے کے ساتھ ساتھ بے شرم ہونے کا طعنہ بھی دیتے۔ اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں اتنی بے دردی سے توڑی گئیں کہ اسے کئی زخم آئے جن پر اب خون جما ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا جب جوان کی موت ہوئی۔ اب آدھی رات ہو چلی تھی اور مرنے والے کی بڑی بہن کا انتظار ہو رہا تھا۔ فجر کے وقت ساس اور نندوں نے مشورہ کر کے خود ہی سب کو بتا دیا کہ دولہن ستی ہونا چاہتی ہے۔ پنڈت جی دولہن کے اس جذبے کو بہت سراہ رہے تھے۔ دولہن کے کان میں جب یہ بات پڑی تو اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ بے بس تھی، نہ تو اسے کچھ بولنے کا اختیار تھا اور نہ بتانے کی اجازت۔ اب تو اسے اپنی زندگی پر بھی اختیار نہیں تھا۔ دہشت کی وجہ سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ صبح ہوئی تو بڑی بہن بھی آ گئی۔ چتا کے لیے لکڑیاں اکٹھی کی گئیں۔ شمشان گھاٹ میں مردے پر لکڑیاں چنی گئیں۔ مردے کے سرہانے دولہن کو بٹھا کر اس کے گرد بھی لکڑیاں چن دی گئیں۔ کبوتر اس سارے عمل کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ارے یہ کیا لکڑیوں کو آگ لگا دی گئی۔ مردے کے ساتھ زندہ لڑکی کو بھی جلا دیا گیا۔ اس کے آگے کبوتروں سے کچھ نہ دیکھا گیا۔ لڑکی کی چیخوں کی آواز سن کر ان کے دل لرز گئے اور وہ وہاں سے فوراً اڑ گئے۔

کبوتروں نے مذہب اور معاشرتی ارتقاء کے تناظر میں کافی کام مکمل کرلیا تھا۔ کچھ دن آرام کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہمالیہ کی قریبی آبادیوں کا دورہ کریں تاکہ ان کے مشاہدات مزید پکے ہوں۔ سفید کبوتری کا اصرار تھا کہ ہمالیہ جانے سے پہلے کامنی کے گاؤں یعنی رام پور چلا جائے تاکہ وہ دیکھ سکے کہ وہ کیسی ہے۔ کبوتری کی ضد کے آگے کبوتر نے ہار مان لی۔ کامنی کو دیکھ کر کبوتری بہت افسردہ ہوئی۔ کامنی جو سرخ وسفید ہوا کرتی تھی اب اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور چہرہ چھائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ سوتے جاگتے وہ اپنے گرد ایک بڑی چادر لپیٹے رکھتی تھی۔ اول تو اس کی ماں کسی کو اس سے ملنے کا موقع ہی نہ دیتی تھی۔ اور اگر کوئی آ بھی جاتا تو یہی بہانہ بنایا جاتا کہ کامنی بیمار ہے۔ ایک رات کبوتروں نے دیکھا کہ اندھیرے میں چندر پچھواڑے میں لگی روڑی کی جڑوں میں گڑھا کھود رہا ہے۔ چوبارے میں لالٹین جل رہی ہے۔ پھر ایک سایہ چلتا ہوا چندر کے پاس آتا ہے اور جلدی جلدی گڑھے میں کوئی چیز رکھ دیتا ہے۔ چندر گڑھے میں مٹی ڈالنا شروع کردیتا ہے یہاں تک کہ گڑھے کو زمین کے متوازی کر کے اوپر روڑی کی کری پھیلا دیتا ہے۔ دونوں کبوتر سائے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ سیڑھیوں کے پاس جاکر دیکھتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ کامنی کی ماں تھی، کبوتروں کے رونگھٹے کھڑے ہوگئے اور وہ سہمے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بڑے ہی دکھی دل کے ساتھ کبوتروں نے رام پور کو خیرباد کہا۔ اب ان کا اگلا ٹارگٹ ہمالیہ، قراقرم اور سیاچن کے علاقے میں مذہبی وتہذیبی حالات کا جائزہ لینا تھا۔ موسمی حالات کی شدت کے پیش نظر دونوں کبوتروں نے اپنے حفاظتی غلاف

چڑھا لیے۔ سیاچن ایسے علاقے میں تو خود انسانوں کی موجودگی کا پتہ لگانا دشوار ہے چہ جائیکہ ان کی تہذیب و ثقافت سے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ کبوتروں کو شروع شروع میں بہت مشکل پیش آئی مگر جلد ہی انہیں معلوم پڑ گیا کہ تمام تر موسمی، سفری اور خوراک کی مشکلات کے باوجود اس علاقے کی آبادی چار لاکھ سے متجاوز کر گئی تھی۔ آبادی کی اکثریت مہاتما بدھ کی پیروکار تھی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وسط ایشیائی ممالک کے دشوار ترین علاقوں میں بدھوں کی اکثریت رہتی ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ بدھ رہتے ہی ہارڈ ایریا میں ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ تبت، بلتستان، سکردو، کیلاش سمیت متعدد علاقے اس کی مثال ہیں جو بدھ عام علاقوں میں رہتے ہیں وہ اتنے غیر محسوس طریقے سے رہ رہے ہیں کہ ان کا رہنا نہ رہنا ایک برابر ہے۔ یوں بھی مہاتما بدھ نے زندگی کو لایعنی قرار دیا ہے۔ اس پس منظر میں بدھ مذہب کے لوگ قدرتی طور پر زندگی کو غیر محسوس طریقے سے گزارنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کے یہاں گھر، جائیداد اور مال وزر کا تصور نہیں اس لیے یہ لوگ لڑائی جھگڑے سے میلوں دور بھاگتے ہیں۔ خدا کی تمام مخلوقات سے محبت اور ان کی حفاظت ان کے ایمان کا جزو لاینفک ہے۔ غالباً ان کے بے ضرر پن کی وجہ سے ایشیا کے اکثریتی مذہب والوں نے انہیں اس قسم کے علاقوں میں دھکیل دیا ہے۔ کبوتروں نے دیکھا کہ جس طرح دیگر مذاہب انحطاط کا شکار ہیں اسی طرح یہ مذہب بھی اس سے بچا ہوا نہیں۔ جس طرح پنڈتوں اور پیش کاروں نے اپنے اپنے مذہب کی روح کی کایا کلپ کی ہے اسی طرح بدھ مت میں بھی بھکشو کی آمد نے مہاتما کی روح کو بہت تڑپایا ہے۔ اسی طرح کا معاشی وجنسی استحصال یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں پر تپسیا کی آڑ میں جنسی تشدد روا رکھا جاتا ہے۔

اس علاقے میں کچھ دن گزار کر پرندے بور گئے۔ ہر طرف برف پوش

پہاڑوں کے سلسلے، نہ کوئی خاص درخت اور نہ پرندے۔ کبوتروں کے لیے ایسے ماحول میں رہنا بہت دشوار کام تھا مگر وہ اپنی ذمہ داری کے سلسلے میں اتنے مخلص تھے کہ وہ اس سے بھی کہیں زیادہ تکالیف برداشت کرسکتے تھے۔ یہ ان کی بقاء کا مسئلہ تھا۔ وہ اپنے جنگل کو کوؤں سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ کبوتر جانتے تھے کہ آزادی کوئی ایسی شے نہیں جو انہیں کوئی طشتری میں پیش کرے۔ آزادی چاہے فکری ہو، معاشی ہو یا مذہبی اس کے لیے کوشش کرنی پڑتی، تن من دھن قربان کرنے پڑتے ہیں۔ اسی جذبہ حریت کے پیشِ نظر کبوتر ہر طرح کی صعوبت برداشت کرنے پر کمربستہ تھے۔

سیاچن ایسے بنجر اور برفیلے علاقے میں بھی کہیں کہیں، اکا دکا گلاب کے جھاڑی نما پودے نظر آجاتے تو کبوتروں کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ کالے کبوتر نے سفید کبوتری کو بتایا کہ بلتی زبان میں سیا، گلاب کو کہتے ہیں اور چن کا مطلب ہے ''والا'' یعنی ان گلابوں کی وجہ سے اس علاقے کا نام سیاچن ہے۔ یوں تو اس پورے علاقے میں بہت سکون تھا مگر مخالف ملکوں کی آرمی والوں کی طرف سے کبھی کوئی گولہ داغا جاتا یا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دیتی تو کبوتروں کا دل دہل جاتا۔ کبوتر یہ سوچ کرتا سف زدہ تھے کہ انسان نے خشکی اور پانی کے چپے چپے کو میدانِ کارزار میں بدل دیا ہے۔ اب کبوتر کافی تھک چکے تھے اور ان کا کام بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اب کبوتروں کے پلان میں مشرقی ومغربی پنجاب کا رخ کرنا شامل تھا کہ اس علاقے میں مزید دواہم قسم کے مذاہب والے لوگ بستے تھے اور کبوتر ان کے مذہبی اطوار و خصائل کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ کبوتروں نے پہلے اقلیتی مذہب یعنی سکھ مت کے مشاہدے کے لیے مشرقی پنجاب کا رخ کیا۔ تقسیم ہند سے قبل پورے پنجاب میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ اس کے مذہبی رہنما گورونانک موجودہ مغربی پنجاب کے ایک قصبے ننکانہ میں پیدا ہوئے۔

تاریخ پنجاب کنہیا لال کے مطابق آپ کا سن پیدائش ۱۳۲۸ء جبکہ بعض دیگر تواریخ کی رو سے ۱۴۶۹ء ہے۔ جس وقت آپ کا شعور بیدار ہوا وہ دور پنجاب کے لیے خاص طور پر اور پورے ہندوستان کے لیے عام طور پر انسان دشمنی، نفرت اور مذہبی منافرت کا دور تھا۔ بابا گورونانک ہندو اور مسلم دونوں مذاہب کی بے عملی سے متنفر تھے۔ اس کے باوجود وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا مذہب بدلنے کی نہیں بلکہ باہمی نفرت ختم کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس مذہب کا وجود ہی بے معنی ہے جو نفرت کو عام کرے۔ گویا وہ صلح و آشتی اور محبت باہمی کے علمبردار تھے۔ ان کے ماننے والے سکھ کہلائے۔ بعد میں اس علاقے کی سیاسی کشمکش نے سکھ دھرم پر جو اثرات مرتب کئے یہی وہ سوال تھا جو کبوتروں کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ کچھ بیرونی حملوں اور کچھ اندرونی خلفشار کی وجہ سے بابا نانک کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ علاقے میں ہر طرف کئی سو سال سے مسلسل پھیلی نفرت، بدامنی اور باہمی چپقلش کو کم کرنے کی کسی تحریک کا حصہ بننے کی بجائے سکھ مت کے لوگ خود اس آگ میں اتنی بری طرح کود گئے کہ یہ دھرم بھی بٹالہ کی کچی دیوار کی حفاظت، گوردوارے کے انتظام و انصرام اور کیسز کی افزائش تک محدود ہو کر رہ گیا۔

جاڑے کا موسم ختم ہوا اور فروری کے پہلے ہفتے میں دوپہر کے وقت دھوپ جسم میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگی۔ کبوتروں نے پاکستان کے میدانی علاقوں کا رخ کیا جہاں بہار کا موسم زمین پر رنگ برنگی پریوں کے سمان اترتا ہے۔ کھیت در کھیت، کیاری در کیاری گھاس اپنا سبز مخمل کا قالین بچھا دیتا ہے۔ پرندے لہریا دار ڈاریں بنا کر فضا میں اڑتے نظر آتے ہیں اور پھر چھپ کر کے کسی گہرے اور گھنے درخت کی شاخوں میں بیٹھ کر اتنے زور سے چہچہاتے ہیں کہ ان کی آواز کافی دیر تک گونج کی صورت کانوں میں رہتی ہے۔ ہوا سانس کی نالی سے ٹکرا کر اتنا خوشگوار احساس پیدا کرتی ہے کہ اسے قدرتی طور پر زیادہ سے زیادہ پھیپھڑوں میں بھرنے کو جی کرتا

ہے۔ کھلی جگہوں پر چھوٹے بڑے کتے مستی کے عالم میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور ہانپتے نظر آتے ہیں۔ ڈوبر مین اور جرمن شیفرڈ سے لے کر دیسی ڈگ تک کے جسم میں ایسی پھرتی بھر جاتی ہے کہ جو بہار کے ایک دو مہینوں کو چھوڑ کر باقی سارا سال نظر نہیں آتی۔ تاحدِ نظر پھیلے گندم کے ہرے کھیتوں کے درمیان کہیں کہیں پھولی ہوئی سرسوں اور توریے کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے سبز چادر پر کسی کامل کاریگر نے آر سے پیلے پھول کاڑھ دیئے ہوں۔ آٹھ دس دن تک تو کبوتر بہار سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن پھر جلد ہی انہیں ان کا مشن یاد آیا۔ جنگل میں اپنے ساتھی کبوتروں کے احساس کی آنچ نے ان کے من موم کی طرح پگھلا دیئے۔

کبوتری نے کبوتر سے پوچھا کہ اب ہم کس علاقے میں ہیں، ہمارا یہاں آنے کا واضح مقصد کیا ہے اور ہمیں کن مربوط بنیادوں پر کام کرنا ہے۔ کبوتر نے گہری سوچ میں گم ہو کر اپنی آنکھوں کو چاروں طرف گھماتے ہوئے کبوتری کی طرف دیکھے بغیر کہنے لگا کہ ہمارا یہاں آنے کا مقصد بھی مذہب سے متعلق اپنے مشاہدات کو تقویت دینا ہے۔ ہم اس وقت لاہور میں ہیں، یہ ایک پرانا اور تاریخی شہر ہے۔ تمہیں یاد ہوگا جب ہم جنگ جُو انسانوں کی بابت معلومات اکٹھی کر رہے تھے تو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کا ذکر بھی آیا تھا۔ دو اڑھائی دو سو سال پہلے یہ علاقہ زبردست جنگ و جدل، افراتفری، لوٹ گھسوٹ اور قتل و غارت گری کی آماجگاہ تھا۔ حملہ آور آئے دن نئے سے نیا جانشیں مقرر کرتے مگر مقامی سازشوں کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ اس دوران البتہ سکھوں اور مرہٹوں کی خوب حوصلہ شکنی ہوئی اور جاٹ کے بن باٹ والے کاروبار کی دیوار میں رخنہ پڑا۔ میں یہاں کے مذہب اور لوگوں کے بارے میں تو تمہیں ساتھ ساتھ بتاتا ہی رہوں گا البتہ اتنا بتانا ضروری ہے کہ یہ ملک جہاں آج ہم ہیں، یہ مذہب ہی کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ کبوتری کہنے لگی، یہ ملک کیا ہوتا ہے۔ کبوتر نے اسے بتایا

کہ ملک سے مراد خشکی کا کوئی ٹکڑا یا قدرتی جزیرہ مراد ہے جہاں کچھ انسان اپنی تہذیب و ثقافت اور تمدن اور اپنی مذہبی روایات کے مطابق رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے ملک کو دوسروں سے الگ کرنے کے لیے لمبی دیواریں کھینچ دیتے ہیں۔ خاردار باڑیں لگا دیتے ہیں یا پھر گہری کھائیاں کھود دیتے ہیں۔ جو کوئی ان سرحدوں کی مخالفت کرتا ہے تو نشانہ بننے والے انسان مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کبوتری کہنے لگی، اس کا مطلب ہے کہ تمام انسانوں کی تہذیب وثقافت ایک جیسی نہیں ہے! کبوتر ایک بار تو دم بخود رہ گیا اور پھر بولا کہ صرف اتنا کہہ دینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوجاتا کہ چونکہ انسانوں کی تہذیب و ثقافت مختلف ہے اس لیے ان کے فوائد و نقصانات مختلف ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تمام دنیا کے انسانوں کا تہذیبی، سماجی ورثہ ایک ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اگر اس تفریق کو جی سے نہ مٹانا چاہے تو پھر بات چاہے جتنی بڑھالے اور خلیج چاہے جتنی وسیع کرلے۔ زیریں وبالائی پنجاب کی اڑانوں کے دوران کبوتروں پر یہ بات انکشاف کی طرح کھلی کہ بظاہر ایک ہی مذہب کے پیروکار ہونے کے باوجود لوگوں میں ہم آہنگی نام کو بھی نہیں تھی۔ جب تمام مذاہب کے لوگ اکٹھے رہتے تھے تو کوئی کسی کو مذہب کے نام پر نہ مارتا تھا۔ بٹوارے کے بعد ایک ہی مذہب کے لوگ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ عبادت گاہوں کے دروازوں پر تفریق کی تختیاں آویزاں تھیں۔ انسانی خون اتنا ارزاں کہ جیسے کوئی بچہ ایئر گن سے غبارے پھوڑ دے۔ نظریاتی وملکی اساس کا تو کہیں شائبہ تک نہیں تھا۔ گلیوں گلیوں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور سڑکوں سڑکوں انسانی بے بسی کا ماتم ہورہا تھا۔ ان دنوں ایک واقعہ پیش آیا۔ لوگ ایک جلوس کی صورت میں میت اٹھائے ایک طرف کو جارہے تھے۔ کبوتری نے پوچھا وہ کیا ہے؟ کبوتر نے کہا، تم یہیں بیٹھو، میں پتہ کر کے آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کبوتر آیا تو اس نے بتایا

کہ کسی مشہور ادیب اور شاعر کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ کبوتری بولی، اس کے قتل ہونے کی وجہ مشہور ہونا ہے یا شاعر اور ادیب ہونا۔ کبوتر کہنے لگا، ان دونوں میں سے اس کے قتل کی کوئی وجہ نہیں ہے، قتل کی وجہ اس کا مذہبی ہونا ہے۔ کبوتری کہنے لگی، اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی بڑا شاعر تو نہ ہوا۔ کبوتر نے جواب دیا کہ میں نے اسے یہاں کا مشہور ادیب کہا ہے، بڑا ادیب یا شاعر نہیں کہا اور مشہور ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی بڑا بھی ہو۔ کبوتری نے پھر سوال کیا، کیا اسے کسی دوسرے مذہب کے لوگوں نے مارا ہے؟ کبوتر نے جواب دیا نہیں اسے اس کے مذہب ہی کے لوگوں نے مارا ہے۔ انسان کی لڑائی کے بارے یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ لڑائی بین المذاہب نہیں بین الانسان ہے۔ اگر اس لڑائی کو نہیں روکا گیا اور ان جذبوں کو لگام نہیں دی گئی تو پھر یوں سمجھ لو کہ دنیا میں کچھ نہیں بچے گا۔ تشدد اور تخریب کاری کے ایسے دلخراش واقعات کبوتروں کی نظروں سے گزرے کہ رو رو کر ان کی گلابی آنکھیں سوجھ گئیں۔ مذہب کے نام پر استحصال، غنڈہ گردی اور تشدد جس قدر فی الوقت اس خطے میں موجود تھا، دنیا کے کسی کونے میں اس کی مثال نہ ملتی تھی۔ کبوتروں نے یہ بھی حساب لگایا کہ لوگ دلی طور پر مذہبی منافرت کے ہاتھوں زچ ہو چکے تھے مگر ڈر کے مارے حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے تھے۔ عوام کی حالت بالکل ویسی ہی ہوگئی تھی جیسی ڈارک ایج میں یورپ کے لوگوں کی۔ کبوتر چاہتے تو یہاں کچھ روز اور قیام کرتے، یہاں انہیں اپنے مقصد کا بیشمار مواد دستیاب تھا مگر ایک تو ان کے پاس وقت کم تھا اور دوسرا وہ آگ اور خون کا کھیل دیکھ کر دلبرداشتہ ہو گئے تھے۔ کبوتری کہنے لگی، یہ ملک کہاں سے کہاں تک جاتا ہے۔ کبوتر کہنے لگا، یہ ملک مشرق میں ان خاردار باڑوں سے شروع ہوتا ہے جو ہم گزر آئے ہیں۔ کبوتری بولی، اچھا اچھا وہ باڑیں جن میں جنگلی خرگوش پھنس کر مرا پڑا تھا، چوچو! بیچارا گھاس میں خوشی سے بھاگ رہا ہوگا کہ کانٹے دار تار سے ٹکرا گیا۔ کبوتر

کہنے لگا، ہاں وہی باڑیں، شمال میں یہ ملک پہاڑوں تک جاتا ہے اور جنوب میں سمندر تک اور مغرب ...... بس چھوڑ، کبوتری نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا اور کہنے لگی، اب یہ بتاؤ کہ کہاں جانا ہے۔ یقین کرو میں تو بہت تھک گئی ہوں، مجھے جنگل بہت یاد آتا ہے۔ اپنے ساتھی کبوتر بہت یاد آتے ہیں مگر جب کوؤں کا سوچتی ہوں تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔

کبوتر بولا، اب ہم بہت لمبے سفر پر جارہے ہیں۔ ایک دن بعد ہم مغربی مما لک کی طرف اڑ جائیں گے۔ وسط ایشیا اور شمال مشرقی ملکوں کی آب و ہوا اور موسم اس قدر روح پرور اور جانفزا ہیں کہ دل چاہتا ہے باقی ساری عمر یہیں گزار دیں لیکن ایسا سوچنا صرف سوچ تک محدود ہے جبکہ اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ کتوبر نے شرارتی آنکھوں سے کبوتری کو دیکھا اور کہنے لگا، کیا خیال ہے یہیں نہ رہ جائیں، چونچ میں چونچ ڈالیں، دم ملائیں اور جھولی پہ جھولی انڈے سیئیں۔ کبوتری بولی جنگل کے کبوتروں کا کیا ہوگا؟ جنگل کے کبوتروں کا سننا تھا کہ کبوتر جھینپ سا گیا، کہنے لگا میں تو مذاق کررہا تھا، اچھا پرسوں ہم لوگ یورپ کے سفر پر جارہے ہیں، مشاہدے اور تجربے کی رو سے اگر کوئی اہم نقطہ واضح نہ ہو تو اسے واضح کرلیں، تم بھی سوچو میں بھی سوچتا ہوں۔

کئی دن کی مسلسل اڑان اور قیام کے بعد دونوں لندن پہنچ گئے۔ کبوتروں نے فادر انتھونی کے چرچ کو اپنا مسکن بنایا۔ کچھ تو یہ چرچ رہائشی آبادیوں سے کافی فاصلے پر تھا۔ کافی فاصلے پر نہ بھی ہوتا تو گرجا گھروں کا ماحول خاص طور پر پرسکون ہوتا ہے۔ چرچ کا بڑا دروازہ صرف اتوار کو کھلتا تھا۔ دعا کا وقت صبح دس بجے سے گیارہ بجے تک تھا۔ اس دوران اردگرد کی پرانی طرز تعمیر کی کوٹھیوں سے چند گاڑیاں برآمد ہوتیں اور گرجا گھر کی دیوار کے پاس ایک دوسری کے پیچھے آ کر رک جاتیں۔ گاڑیاں میں سے زیادہ تر بڑی عمر کے لوگ نکلتے اور دعا میں شرکت کے بعد پورے

گیارہ بجے ایک ایک دو دو کر کے واپس چلے جاتے۔ کبوتر نے کبوتری کو بتایا کہ بیسویں صدی کے نصف تک یورپ اور امریکہ کے گرجا گھروں میں کالے لوگوں کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر آہستہ جب چرچ کی جانب خود گوروں کا رجحان کم ہونے لگا اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے شور مچانا شروع کیا تو کالے لوگوں کو گرجا گھروں میں داخل ہونے کی اجازت دی جانے لگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات بہت سادہ اور انسانی ہمدردی پر مبنی ہیں۔ آپ نے انسان کو دوسرے انسانوں پر ظلم وستم روا رکھنے سے منع فرمایا، ایثار وقربانی کو شرف آدمیت سے تعبیر فرمایا۔ آپ نے جھوٹ کو انسان کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا اور لوگوں کو سادہ زندگی اختیار کرنے پر آمادہ فرمایا۔ آپ نے بلاتفریق رنگ ونسل اور زبان تمام انسانوں سے محبت اور یگانگت کا درس دیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اپنی تعلیمات کا اعلیٰ عملی نمونہ پیش کیا۔ مگر افسوس کہ آپ کے بعد آپ کے ماننے والوں نے بھی دوسرے مذاہب کے مصداق مذہب میں نئی نئی چیزیں ایجاد کر کے اس کی اصل روح کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ یہاں تک کہ آپ پر نازل شدہ خدا کی کتاب میں ترمیم وتحریف سے بھی گریز نہ کیا۔ انسانی مساوات کے سنہری اصولوں کو پس پشت ڈال کر رنگ اور نسل کی بنیاد پر تفرقات کو اتنی ہوا دی گئی کہ بیسویں صدی تک لوگوں کی اکثریت اگر ظاہری نہیں تو باطنی طور پر مذہب سے نالاں ہوگئی۔ دوسری طرف اس صدی میں ریکارڈ سائنسی ترقی نے انسان کو مذہب سے غیر شعوری طور پر دور کر دیا۔ مذہبی گروہوں میں اتنی اہلیت نہ تھی کہ وہ جدید دور کے مطابق مذہبی معاملات کو جدید خطوط پر استوار کرسکیں، اس طرح انسان بنیادی طور پر قدامت پرست اور جدت طراز کے دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ سائنس کی روز افزاوں ترقی سے جدت طراز گروپ میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور قدامت پرست گروپ قلیل سے قلیل تر ہوتا گیا اور مذہبی عبادت گاہوں اور گرجا گھروں میں مقید ہوکر رہ گیا۔

دنیائے مذاہب کی بتدریج ترقی کا جائزہ لیں تو یہ بات حیرت انگیز طور پر سامنے آتی ہے کہ مشرق بعید اور افریقی ممالک کی ترقی پذیر اقوام کی طرح یورپ اور امریکہ کی ڈارک ایجز کے دوران وہاں بھی مذہبی رویے کچھ مختلف نہ تھے۔ پنڈت، پیر پروہت، بھکشو اور ملا کی طرح مذہب کا تمام تر دارومدار پادری پر تھا۔ مذہب کے نام پر جنسی و معاشی استحصال اور اخلاقی بلیک میل عروج پر تھی۔ مذہبی رسومات اور اصول وضوابط نے نام نہاد مذہبی لوگوں کے ذریعے مشکل سے ناممکن کی طرف سفر کیا اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں نے تنگ آ کر خود کو مذہب سے الگ کرنا شروع کر دیا۔ آج دنیا میں عیسائی مذہب کے ماننے والے نہ صرف یہ کہ اپنی تعداد کے لحاظ سے زیادہ ہیں بلکہ اپنی سائنسی و معاشی قوت کے بل بوتے پر خوشحال بھی ہیں۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یورپ کی ترقی کی بنیاد اس کا مذہب نہیں بلکہ سائنسی علم اور طریقہ ہائے کار ہے۔ جن مذاہب میں ابھی تک سائنس کو روایتی نظریات سے متصادم قرار دیا جاتا ہے ان اقوام کی معاشی اور اخلاقی حالت اس صدی میں بھی ابتر ہے اور جانے کب تک ابتر رہے گی۔

کبوتر اور کبوتری نے چار کونوں والے واحد گنبد پر صلیب سے ذرا تلے مشرق کی طرف والے چبوترے میں رہنا شروع کر دیا۔ یہاں رہ کر کبوتروں کو اپنا ریسرچ ورک مکمل کرنے کے لیے بہت وقت میسر تھا۔ انہیں تو اپنے دانے دنکے کی بھی فکر نہیں تھی کیونکہ سوزینا ہر صبح گرجے کی ترچھی چھت پر ڈبل روٹی کے بھورے، چاول اور باجرا وغیرہ پھینک دیتی تھی اور چینی کی پیالی میں پانی بھی ڈال دیتی تھی۔ سوزینا فادر انتھونی کی اکلوتی بیٹی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ چرچ سے ملحقہ کوارٹر میں رہتی تھی۔ سوزینا بہت خوبصورت تھی، کبوتری جب بھی اسے دیکھتی تو اس کی تعریف کرتی۔ تقریباً سولہ سترہ سال کی سرخ و سفید رنگت اور سنہرے بالوں والی سوزینا ہر وقت گم سم رہتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی اور نیلی آنکھوں میں ہر وقت آنسو تیرتے

رہتے تھے۔ خاص کر جب وہ صبح تیار ہو کر سسٹرز ہاؤس جاتی تو بہت دکھی نظر آتی تھی۔ اس کی ماں اس کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ اس کو اس کے باپ نے ہی پالا تھا۔ جب اسے ذرا ہوش آیا تو اس کے باپ نے اسے سسٹرز ہاؤس میں داخل کروادیا۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ سسٹر نہیں بننا چاہتی بلکہ جوزف سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے باپ کو اس کی بات سن کر بہت غصہ آیا اور اس نے رٹے رٹائے انداز میں خداوند کریم کی تعلیمات سے متعلق اسے بھرپور لیکچر دیا اور اسی شام چیف سسٹر کو بھی بتادیا کہ سوزینا بھٹک گئی ہے اس لیے وہ اس پر ذرا سختی کرے تاکہ جس پراگندہ خیالی کی وہ شکار ہے، اس کے ذہن میں اس کی نمو کو کچلا جاسکے۔ اگلے دن سسٹر نے سوزینا کو بلایا اور سزا دینے کے لیے کرسی پر جھکالیا اور اس کا سفید لباس اوپر اٹھا کر اس کے سرین پر اتنے زور سے بید کی سوٹیاں ماریں کہ اس کے لیے بنچ پر بیٹھنا محال ہوگیا۔ سوزینا واپس آ کر ساری رات روتی رہی۔ اس نے جوزف سے ملنے کی کوشش کی مگر اس کے باپ نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ اس کے باپ نے جوزف کے باپ سے جوزف کی شکایت بھی کی جو اس کے خیال میں سوزینا کو خراب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ دوسری طرف جوزف کا باپ ریورنڈ فادر آئزک بھی جوزف پر بہت برہم ہوا۔ وہ جوزف کو اپنے سے کہیں اعلیٰ فادر بنانا چاہتا تھا۔ اپنی آخری عمر میں راہبانیت سے متعلق اس کے نظریات بہت پختہ ہوگئے تھے اور وہ اپنے بیٹے کے پوپ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

جوزف اپنے والد کے نظریات سے باغی تھا۔ اپنے طور پر اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں جاب بھی حاصل کرلی تھی۔ جوزف سوزینا سے محبت کرتا تھا اور شادی کے بعد فطری اور سیدھی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے سوزینا کو بھی شادی کے لیے راضی کرلیا تھا۔ سوزینا بھی اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے ساتھ زندگی

گزارنا چاہتی تھی۔ اب دونوں کے والد ان کے بیچ ایک دیوار بن گئے تھے۔ ایک اپنے بیٹے کو کھینچتا تھا تو دوسرا اپنی بیٹی کو۔ جب کوئی دوسری راہ نظر نہ آئی تو جوزف اور سوزینا نے رات کو چھپ کر چرچ کے احاطے میں ملنا شروع کر دیا۔ آدھی رات کو جب سوزینا کا باپ سو جاتا تو سوزینا چرچ کے پیچھے والے قبرستان میں درختوں کے جھنڈ کے پاس چلی جاتی اور جوزف بھی اپنے باپ کو بیوقوف بنا کر وہیں پہنچ جاتا۔ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے میں جذب ہو کر باتیں کرتے اور محبت کی دھیمی دھیمی آگ میں جلتے رہتے۔ جب دونوں کا اعتماد بحال ہوا اور انہیں یقین ہو گیا کہ کبوتروں کے سوا انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تو ان کی نفسانی خواہش نے خلوت کی آڑ میں پھلنا پھولنا شروع کر دیا۔ آج اس خواہش نے ایک مرحلہ طے کیا تو کل دوسرے کی آرزو پروان چڑھنے لگی۔ پھر وہ دونوں جو ایک دوسرے کے لیے سربستہ راز ہوا کرتے تھے آہستہ آہستہ لذت کا نشان بن گئے۔ تمام تر احتیاطوں اور کوششو ں کے باوجود کئے پر پچھتانے کا وقت آ گیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ نہ تو جوزف کی ماں زندہ تھی اور نہ سوزینا کی۔ جو باپ تھے وہ پہلے ہی ان دونوں کے مخالف تھے۔ مذہبی لوگوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان پر معاشرتی دباؤ بھی بدستور موجود تھا۔ تنگ آ کر دونوں نے کورٹ میرج کا فیصلہ کر لیا اور ایک رات جو سوزینا جوزف سے ملنے گئی تو واپس نہیں آئی۔

کبوتر اور کبوتری کو سوزینا کے جانے کا رنج تھا مگر وہ خوش تھے کہ سوزینا اور جوزف کی دلی مراد پوری ہوئی۔ اب کوئی بھی ان کو دانا ڈالنے والا نہیں تھا۔ یوں بھی نومبر کا مہینہ تھا اور لندن شدید سردی کی لپیٹ میں تھا اس لیے کبوتروں نے اپنے مشاہدے اور مذاہب سے متعلق سفارشات کی سمری تیار کی اور اپنے اگلے سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ کبوتری بولی، مجھے تو جنگل کی بہت یاد آ رہی ہے۔ ہم کافی عرصہ انسانوں کے بیچ گھوم چکے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہے جو ہم دوسری بہت سی چیزوں

کے متعلق اپنے پاس سے محنت کئے بغیر ہی رائے اپنی طرف سے پیش کردیں۔ اس طرح ہم بہت سی مزید مشکلات سے بچ جائیں گے۔ کبوتر پہلے تو کبوتری کی بات کو غور سے سنتا رہا اور پھر ایک دم اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ کبوتری نے دفعتاً اپنا جائزہ لیا اور کہنے لگی تم میری طرف دیکھ کر کیوں ہنس رہے ہو۔ کبوتر بوالا تم نے جو بات کی مجھے تم سے اسی کی توقع تھی۔ اتنا عرصہ انسانوں کے درمیان گزارنے کے بعد کسی پرندے میں اس طرح کی سوچ کا پروان چڑھنا کسی اچنبے کی بات نہیں۔ انسان ایسا کرتے ہیں۔ ریسرچ اور مردم شماری کے نام پر حکومتوں کے اربوں روپے خرچ کروانے کے بعد رپورٹ پھر بھی اپنی طرف سے ہی بناتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں تو یہ رواج زوروں پر ہے۔ گھر بیٹھے بٹھائے سروے مکمل ہوجاتے ہیں، دھڑا دھڑ فارم پر کر لیے جاتے ہیں اور غلط ملط اعداد وشمار جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے ہیں۔ وہ انسان ہیں، اللہ کی مرضی سے زمین کے سیاہ و سپید کے مالک۔ ہم پرندے ہیں، غریب پرندے، نہ ہمارے پاس وسائل ہیں اور نہ وقت۔ ہمیں ہر کام صحیح صحیح کرنا پڑے گا۔

کالے کبوتر اور سفید کبوتری کی واپسی کی خبر ملتے ہی پورے جنگل کے کبوتروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں کبوتروں کی آمد کو بھی ان کی روانگی اور مشن کی طرح خفیہ رکھا گیا اس لیے انسانی بستیوں کے برعکس نہ تو استقبال کی تیاریاں کی گئیں اور نہ اطراف میں اودھم مچایا گیا۔ دو دن کبوتروں کو مکمل آرام کا موقع ملا۔ دو دن بعد مہمان کبوتر نے رات کے وقت جنگلی بیریوں کے سائے میں کبوتروں کا اجلاس طلب کیا۔ کالے کبوتر نے مختصر طور پر اپنی مہم کے مشاہدات اور تجربات دوسرے کبوتروں کے سامنے بیان کئے۔ اگرچہ جنگل میں لندن جیسی سردی تو نہ تھی مگر ہوا میں خنکی ضرور موجود تھی۔ شاید اسی وجہ سے تمام کبوتر اپنے پنجے مٹی میں دبا کر اور اپنے سر اپنی گردن کے بالوں میں چھپا کر بیٹھے تھے۔ چاند کی روشنی بیریوں کے

پتوں سے چھن چھن کر کبوتروں کی گردنوں اور پروں پر پڑتی تو وہ گوٹے کی تاروں کی طرح چمکنے لگتے۔ کبوتروں کو اس وقت کوؤں کی اس لیے بھی فکر نہیں تھی کہ کوّے رات درختوں کی چوٹیوں پر گزارتے ہیں اور وہ بھی اونچے درختوں کی چوٹیوں پر بالکل ویسے ہی جس طرح وہ اپنے گھونسلے اونچے درختوں پر بناتے ہیں۔ سفید کبوتری کی مدد سے کالے کبوتر نے اپنی بات مکمل کی۔ تمام کبوتر اسی بات پر متفق تھے اور اسے اُپنے لیے کارآمد بھی قرار دیتے تھے کہ Ethics کے نام پر کوؤں کو چھوٹے چھوٹے مفاداتی اور غیر نظریاتی گروہوں میں تقسیم کرنے کا عمل شروع کیا جائے۔ ہر گروہ تشکیل دینے سے پیش تر اس کے سرغنہ کا انتظام کیا جائے۔ ایک بار ان گروہوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو یہ خود بخود نسل در نسل آگے بڑھتا چلا جائے گا اور اس پر مزید محنت کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مہمان کبوتر نے ایک بار پھر دونوں کبوتروں کی سفارشات کی روشنی میں آئندہ کے لائحہ عمل کو دہرایا اور کالے کبوتر اور سفید کبوتری کی آئندہ مہم کا اعلان کیا۔ کبوتروں کی اگلی مہم انسانوں کے نظام ہائے تعلیم سے متعلق تھی۔ ریسرچ ونگ نے اس بارے میں بہت سی معلومات پہلے ہی اکٹھی کر لی تھیں۔ اس بارے میں یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ چونکہ مغربی اقوام نے اپنے تعلیمی نظام کے سقم وقت کے ساتھ ساتھ بہت حد تک درست کر لیے ہیں اس لیے ان کے مطالعے کی کبوتروں کو ضرورت نہ ہے جبکہ ایشیائی ممالک میں ایسا تعلیمی سٹرکچر اب بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے جو فکری و عملی طور پر انسانوں کو مختلف کلاسوں میں تقسیم کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ طبقات نہ صرف ظاہری طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ روحانی اور عملی طور پر بھی ایک دوسرے سے اس قدر جدا ہیں کہ ان کے باہم معاشرتی تعلق سے تفریق اور انتشار یقینی ہو جاتا ہے۔ یہی تفریق اور انتشار ہی دراصل کبوتروں کی دلچسپی کا باعث تھا۔ اپنے اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مہمان کبوتر نے کالے کبوتر اور سفید کبوتری کو ملک

پاکستان کی مہم پر روانگی کا حکم دیا اور انہیں بتایا کہ اس ملک میں جو تعلیمی نظام رائج ہیں ان کے مطالعے سے ایسا مواد یقینی طور پر کبوتروں کے ہاتھ لگے گا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کبوتر کوؤں میں نااتفاقی کا بیج بو سکیں گے اور ان کی مجتمع قوت کا شیرازہ بکھیرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ دونوں مہم جو کبوتروں نے ہفتے بھر میں اپنی نئی مہم کی تیاری مکمل کی، نئے ملک کے موسموں، اوقات اور اجناس کے بارے معلومات حاصل کیں اور ایک رات کوؤں کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی نئی مہم پر اڑ گئے۔ کئی دن اور کئی راتوں کی اڑان اور پڑاؤ کے بعد کبوتر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

اصل مشاہدے سے قبل کبوتر موجودہ مہم کے کام سے متعلق اپنی معلومات پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتے تھے۔ اب کے بریفنگ کی باری کبوتری کی تھی کیونکہ انسان کے تعلیمی نظاموں سے متعلق مواد پر زیادہ کام اسی نے کیا تھا۔ کبوتری ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کبوتر نے جھپٹنے کے انداز میں پہلے کبوتری کی گردن میں گردن ڈالی اور پھر اپنے پنجے اس کی خم دار کمر پر ٹکاتے ہوئے دم سے دم ملایا ہی چاہتا تھا کہ کبوتری بھی اتنی ہی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئی اور کبوتر کی طرف منہ کر کے زور دار ٹھونگا اس کی آنکھ پر مارا کہ کبوتر اپنی گردن جھٹکتا رہ گیا۔ کبوتر کی آنکھ سے پانی بہہ رہا تھا اور وہ ایک طرف کھسیانہ ہوا بیٹھا تھا۔ کبوتری نے مہان کبوتر کی ہدایات اور کبوتروں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کبوتر کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جنہیں وہ فطرت سے مجبور ہو کر کچھ وقت کے لیے فراموش کر چکا تھا۔ تھوڑی تھوڑی آنکھ کھلنے لگی تو کبوتر نے کبوتری کی طرف معذرت سے دیکھتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آنے کی استدعا کی۔ کبوتری کہنے لگی، اس وقت ہم جس ملک میں موجود ہیں وہاں بیک وقت چار قسم کا نظام تعلیم رائج ہے اور ان چار مختلف نظام ہائے تعلیم سے مستفید لوگ چار مختلف نوعیت کی فکر کے ساتھ یہاں کے قومی

دھارے میں شریک ہو رہے ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو دینی مدرسوں کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان مدرسوں کی بنیاد متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور اقتدار میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت ان مدرسوں کا نظم ونسق چلانے کے لیے ہر مدرسہ کے ساتھ کچھ زرعی جاگیر بھی وقف ہوتی تھی جس کی آمدنی طلباء و اساتذہ کی فلاح پر خرچ کی جاتی تھی۔ اس قسم کے مدرسوں میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مدرسہ رحیمیہ اور پھر ندوۃ العلماء اور دیوبند کا مدرسہ بہت مشہور ہوئے۔ انگریزوں نے اپنے دورِاقتدار میں جہاں اس خطے کے سیاسی و مالی نظام میں بے پناہ تبدیلیاں کیں وہاں اس کے تعلیمی نظام کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مساجد اور مدرسوں کی جاگیریں بے دریغ اپنے وفاداروں میں تقسیم کر دی گئیں۔ وہ نظامِ تعلیم جو نہ صرف طلباء کی علمی ضروریات سے بہرہ ور تھا بلکہ ان کی روحانی تربیت کا ذریعہ بھی تھا بعد میں لوگوں کے خیرات وصدقات پر منحصر ہونے کی وجہ سے طلباء و اساتذہ کی عزتِ نفس کی پامالی پر منتج ہو کر رہ گیا۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی آزاد ریاست کے قیام کے باوجود بھی اس طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی اور سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ نظام دن بدن گراوٹ کا شکار ہے۔ صرف ونحو اور فقہ ومنطق کا صدیوں پرانا سلیبس آج بھی مدرسوں میں جوں کا توں رائج ہے۔ علماء و اساتذہ اپنے معاشی مسائل کا شکار ہونے کی وجہ سے اس جانب توجہ نہیں دے سکتے نتیجتاً بظاہر پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہر سال ان مدرسوں سے فارغ ہو رہی ہے مگر یہ تعداد ملک کے موجودہ سیاسی اور معاشی حالات میں کسی طور بھی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی اہل نہیں۔ اس قسم کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ملک میں کوئی مستقبل نہیں۔ نہ انہیں کسی اہم سرکاری نوکری کے لیے چنا جاتا ہے اور نہ کسی ریاستی عہدے کے لیے ان کے اس علم کو شمار میں لایا جاتا ہے۔ سرکاری سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ خود ساختہ و نام نہاد مذہبی تنظیموں نے پچھلے کچھ

سالوں سے ان مدرسوں کے طالب علموں کو اپنا آلہ کار بنایا ہوا ہے اور اب طلباء کی کثیر تعداد ان تنظیموں کے عسکری عزائم کے زیر اثر ہے جس سے ملک میں دن بدن دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے اور جو نقصان نوجوان نسل کے علم اور وقت کا ہورہا ہے اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔ کچھ سیاسی تنظیموں نے تو مدرسوں کے نام پر بیرونی امداد کے حصول اور استعمال میں اس قدر بے ضابطگیاں کی ہیں کہ اب وہ بھی ملک کے دیگر اداروں کی طرح کرپشن ایسے الزامات سے بری الذمہ نہیں۔ان سب باتوں کے باوجود ملک میں یہ تعلیمی نظام اگر اب بھی رائج ہے تو یقیناً اس کے پیچھے کچھ لوگوں کے معاشی اور سیاسی اور معاشرتی تحفظات کارفرما ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو عام سرکاری سکولوں سے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ سکول اور ان کا انتظام اسی نظام تعلیم سے ماخوذ ہے جس کو انگریزوں نے ہندوستان میں رائج کیا تھا یعنی لارڈ میکالے کا متعارف شدہ نظام تعلیم جس کے بارے میں خود اس نے ہی کہا تھا کہ ہمارا مقصد لوگوں کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا ہے کہ جو اپنے رنگ کے اعتبار سے تو مشرقی ہوں مگر اپنی سوچ کے اعتبار سے مغربی۔ بلاشبہ میکالے نے جو کہا تھا اس کے نظام نے سو فیصد کر دکھایا۔ انگریزوں سے آزادی کے بعد اور پھر تقسیم کے بعد سے لیکر اب تک یہ نظام جوں کا توں موجود ہے اور مستقبل قریب میں اس کی تبدیلی یا بہتری کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔اب ذرا ان سکولوں کی حالت زار کا بھی جائزہ لیں جہاں یہ نظام رائج ہے۔ عام زبان میں ان سکولوں کو ٹاٹ سکول یا کھوتی سکول کہا جاتا ہے۔ بیشتر سکولوں کی نہ عمارت ہے اور نہ چار دیواری، نہ فرنیچر ہے اور نہ تختہ سیاہ۔ اساتذہ کی تقرری کے وقت نہ میلان کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ معیار کا۔ سلیبس اتنا ناقص اور امتحانات کا نظام اتنا غیر معیاری کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کے ذہنی معیار میں کوئی خاص فرق

محسوس ہی نہیں ہوتا۔ انگریزی اور پھر سائنس کی تعلیم ان سکولوں میں مڈل سٹینڈرڈ سے شروع ہوتی ہے اور اس طرح ان سکولوں کے فارغ التحصیل طلباء اپنی عملی زندگی میں کانوینٹ اور انگلش میڈیم کے طلباء و طالبات سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اساتذہ کے تعلیمی معیار کے بارے بہت سی دلچسپ باتیں مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سکول کا استاد سی یو پی سپ پڑھا رہا تھا۔ ایک طالبعلم نے درمیان میں ٹوک دیا کہ جناب سی یو پی کپ ہوتا ہے۔ استاد نے غصے سے طالبعلم کو دیکھا اور کہنے لگا کہ اتنی تنخواہ میں سی یو پی سپ ہی ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں پرائمری کی سطح پر خاص طور سے اعلیٰ تعلیم یافتہ یہاں تک کہ پی ایچ ڈی لوگوں کو تعینات کیا جاتا ہے جبکہ یہاں صرف میٹرک پاس اور بعض حالات میں مڈل پاس لوگوں کو لگا دیا جاتا ہے۔ یعنی جن لوگوں کو ابھی خود تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے انہیں تعلیم دینے پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ گزارہ مشکل سے نہیں بلکہ ہوتا ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے اساتذہ اپنے کام پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے روزی کمانے کے دوسرے ذرائع میں دلچسپی لینے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو پرائیویٹ سکولوں یا کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ نظام ہائے تعلیم ہی کی طرح یہاں کے لوگوں کو بھی چار قسم کے واضح طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم بہت غریب لوگوں کی ہے جنہیں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی حاصل نہیں۔ یہ طبقہ یا تو سرے سے اپنے بچوں کو تعلیم ہی نہیں دلواتا بلکہ انہیں انتہائی بچپن سے محنت مشقت پر لگا دیتا ہے تاکہ گھر کا چولہا اگر تین نہیں تو ایک یا دو وقت ہی چل سکے۔ اگر تعلیم دلواتا بھی ہے تو مدرسے کی تعلیم کہ اس طرح کم از کم بچوں کے روٹی کپڑے اور خوراک کی فکر سے خود کو آزاد تصور کیا جاسکے۔ دوسرا طبقہ غریب لوگوں کا ہے۔ اس طبقے کو کسی نہ کسی طرح تھوڑی بہت بنیادی ضروریات بہم ہو جاتی ہیں۔ یہ طبقہ بھی اپنے بچوں کو مدرسے کی تعلیم

دلوانے پر مجبور ہے جبکہ کچھ لوگ اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے سرکاری سکولوں میں بھی داخل کرواتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طبقے کے کتنے بچے ان سکولوں سے مستفید ہو پاتے ہیں اور کس لیول تک تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے والدین اپنے بچوں کو پرائمری سے زیادہ تعلیم نہیں دلوا سکتے۔ اگر کوئی بہت بھی ہمت کرے تو مڈل یا میٹرک تک بچے کو تعلیم دلوا کر کسی نہ کسی کام میں ڈال دیا جاتا ہے تا کہ آمدنی کا کوئی ذریعہ پیدا کیا جا سکے۔ تیسرا طبقہ متوسط طبقہ ہے۔ اس طبقے کے کچھ لوگ اپنے بچوں کو حکومت کے عام تعلیمی اداروں میں تعلیم دلواتے ہیں اور کچھ دیکھا دیکھی اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے عام پرائیویٹ سکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ چوتھا طبقہ امیر لوگوں کا ہے اور یہ طبقہ اپنے بچوں کے لیے حکومتی یا بیوروکریسی کے زیر انتظام چلنے والے سکولوں کالجوں کا انتخاب کرتا ہے یا پھر خاص پرائیویٹ سکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کراتا ہے۔ کبوتری کچھ وقت کے لیے خاموش ہوگئی، شاید وہ پنجوں پر کھڑی کھڑی تھک گئی تھی۔ اس نے فطرتاً نرم جگہ کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر نرم جگہ تو کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ ایک سرکاری عمارت کی چھت پر بیٹھے تھے جس پر ٹائلیں لگی ہوئی تھیں جن کا سرخ رنگ کائی کی وجہ سے سبزی مائل سیاہ ہو چکا تھا مگر رات کی وجہ سے تو بالکل سیاہ ہی لگ رہا تھا۔ کبوتری نے اپنے پنجوں کو اکٹھا کیا اور ٹھنڈی ٹھنڈی چھت پر پیٹ کے بل بیٹھ گئی۔ اس لمحے کبوتر بھی کبوتری کے پاس آ کر اسی انداز میں بیٹھ گیا۔ کبوتری نے اپنی بات پھر شروع کی، میں بات کر رہی تھی تیسری قسم کے لوگوں کی جو عام پرائیویٹ سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان سکولوں کا سلیبس بھی حکومت کے تمام سکولوں سے مختلف ہے۔ ہر سکول نے سلیبس اور معیار تعلیم سے متعلق اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد قائم کی ہوئی ہے۔ یہ سکول چونکہ کمرشل بنیادوں پر قائم ہیں اور ان کا مقصد کاروبار ہے اس لیے یہ پیسے بنانے کا کوئی دقیقہ

فروگذاشت نہیں ہونے دیتے۔ یہاں تک کہ بچوں کے یونیفارم اور کتابوں اور کاپیوں وغیرہ کی دستیابی تک کو کاروبار سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ ان عام پرائیویٹ سکولوں میں بھی اساتذہ کی اپنی تعلیم یا تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ملک میں بے روزگاری عام ہونے کی وجہ سے بے شمار لوگ ان سکولوں میں ملازمت کرنے پر مجبور ہیں لیکن ان کا مقصد بھی قوم کے بچوں کو تعلیم دینا نہیں بلکہ اپنے معاشی حالات کو کسی حد تک درست کرنا ہی ہے۔ ان سکولوں کے اساتذہ کی تنخواہیں عام حکومت کے سکولوں سے بھی کم ہیں جس کی بنا پر اساتذہ طلباء و طالبات کو ٹیوشن کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ ٹیوشن ایک فیشن کی صورت معاشرے میں پروان چڑھ رہی ہے۔ اسے فیشن بھی نہیں کہا جا سکتا کہ والدین تو بہرحال مجبوراً اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ سکول کی فیسیں الگ اور ٹیوشن کا خرچہ مزید ان کے معاشی مسائل میں روزمرہ اضافے کا باعث ہے۔ وہی اساتذہ جو سکولوں میں پڑھاتے ہیں، سکول کے اوقات کے بعد ٹیوشن پڑھاتے نظر آتے ہیں۔ ٹیوشن کے ناسور نے طلباء و طالبات کے تعلیمی انحطاط میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جو لوگ اپنے بچوں کو ٹیوشن نہیں رکھوا سکتے ان کے لیے بے شمار مشکلات جنم لے رہی ہیں۔ سکولوں کالجوں میں سلیبس مکمل نہیں پڑھایا جاتا جس کی وجہ سے طالبعلم Selective Studies، رٹا ازم، گیس اور نقل وغیرہ کے چکر میں پڑ کر تعلیم کی اصلیت اور افادیت سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو خاص پرائیویٹ سکولوں کالجوں یا پھر حکومت اور بیوروکریسی یا فوج کی زیرِنگرانی کام کرنے والے تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے ادارے ملک کے امیر طبقے نے خصوصی طور پر اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کئے ہیں۔ بھاری فیسوں اور دوسرے اخراجات کی وجہ سے غریب لوگ ان تعلیمی اداروں میں اپنے بچوں کو داخل کروانا تو کجا ان کے دروازوں

کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں کا سلیبس عالمی سطح کی یونیورسٹیوں مثلاً آکسفورڈ اور کانونٹ سے منگوایا جاتا ہے، یہاں تک کہ انہیں اداروں کی شائع شدہ کتب جوں کی توں متعارف کروائی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ چونکہ ملک کے تمام اعلیٰ سطحی امتحانات اور ملازمتیں انگریزی زبان پر عبور سے مشروط ہیں اس لیے اس طبقے کے لوگ پہلے سے طے شدہ نظام کی وجہ سے اعلیٰ عہدے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جبکہ غریب طبقہ کے لوگ تمام تر محنت کے باوجود اس کلاس کے برابر کھڑے ہونے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ہر سال اکا دکا کیس میں اگر ایسا ہو بھی جائے تو اسے طبقاتی تفریق کے خلاف ردعمل ہی سمجھا جائے گا۔ یہ تعلیمی ادارے چونکہ امیر طبقے کے لوگوں اور ان کے بچوں کے مستقبل سے متعلق ہیں اس لیے ان کی تعمیر اور حفاظت کا پورا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے اچھے سکولوں اور کالجوں کے موافق تمام تر تعلیمی وغیر نصابی سہولیات یہاں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ کبوتر جواب تک چپ بیٹھا تھا اپنی چونچ سے پروں تلے کھجلی کرنے کے بعد بولا کہ یہ کیسا ملک ہے اور یہاں کے لوگ کیسے ہیں کہ ایک ہی ملک اور ایک ہی مذہب اور ایک ہی نسل یعنی انسانی نسل کے بچوں کے لیے چار قسم کا نظام تعلیم۔ شاید ان لوگوں کو تعلیم کے مقاصد اور اس کی افادیت کا علم ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے سنجیدگی سے کبھی بھی اس طرف توجہ نہیں دی جس کا ثبوت یہ ہے کہ نت نئی آنے والی حکومتوں میں سے کسی نے بھی خلوصِ نیت سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ملکی بجٹ کا صرف ایک سے تین فیصد تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے اور یہ بھی خرچ ہوتے ہوتے اپنے آدھے سے بھی کم پر آجاتا ہے۔ ان سے تو کوے ہی اچھے ہیں کہ جو کام بھی کرتے ہیں مل جل کر اور ایک ہو کر کرتے ہیں۔ کوؤں کو اچھا کہنے پر ایک دم کبوتری نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کبوتر کی جانب دیکھا

اور کہنے لگی کہ تم نے کوؤں کو اچھا کیوں کہا! اگر کوّے اچھے ہیں تو ہم یہاں کیا لینے آئے ہیں۔ کبوتر بھی جذباتی ہوگیا اور کہنے لگا کہ واقعی کوّے اچھے ہیں اور اچھائی اگر دشمن کی بھی ہو تو اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور اسے چھپانا نہیں چاہئے۔ ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ کوّے کوؤں کے لیے اچھے ہیں کبوتروں کے لیے نہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم یہاں کے تعلیمی نظام کی خرابیوں اور کوتاہیوں کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کریں اور ان سے متعلق اپنی سفارشات پیش کریں تاکہ ان کو کوؤں میں متعارف کروانے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا جاسکے۔ دونوں کبوتروں کی آنکھیں نیند کی وجہ سے بند ہونے لگی تھیں اور دور و نزدیک کی مسجدوں سے تہجد کی اذان کی آواز آرہی تھی۔ خنکی کی وجہ سے دونوں کبوتر مزید ایک دوسرے میں گھس کر اونگھنے لگے۔

ضلع کچہری میں لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے ہارن یا پھر شاید آٹو رکشا کی آواز سے کبوتروں کی آنکھ کھلی۔ ابھی وہ دانے دنکے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کسی خدا ترس سائل نے مٹھیاں بھر بھر کر چاولوں کے دانے عمارت کی چھت پر پھینکنا شروع کردیئے۔ اسے دانے پھینکتے سب سے پہلے کوؤں نے ہی دیکھا اور اپنی بمبوجیسی چونچوں کو دانوں سے بھرنا شروع کردیا۔ کوؤں کی لوٹ کھسوٹ کے بعد بھی اتنے دانے ادھر ادھر ضرور بکھر گئے تھے کہ کبوتروں نے اطمینان سے اپنا پیٹ بھرا اور جی ٹی روڈ پر واقع مدرسے سے ملحقہ مسجد کے مینار پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ مینار دراصل ان کی مچان تھا جہاں سے وہ مدرسے کے نظامِ تعلیم اور طلباء و طالبات اور اساتذہ کے معاملات کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے یعنی پہلی قسم کے نظامِ تعلیم کا خود اپنی آنکھوں سے جائزہ لینا چاہتے تھے۔

اگلی صبح مینار پر لگے سپیکروں میں مؤذن کے پہلے کھنگورے کے ساتھ ہی کبوتر اور کبوتری کی آنکھ کھل گئی۔ کئی دنوں کی تھکن کے بعد دونوں کبوتر اتنی گہری نیند

سوئے تھے کہ چند گھنٹوں کے لیے انہیں یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہاں کس کام سے آئے تھے۔ اب جبکہ ان کی کچھ نیند پوری ہو چکی تو انہوں نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ اپنے دماغوں کو بھی بیدار کرنا شروع کیا اور دونوں یکسوئی سے مدرسے کے ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ موسم خوشگوار تھا اور بادِنسیم کے جھونکے جسم و روح میں فرحت اور توانائی کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ عبادت سے فراغت کے بعد مدرسے کے بچوں نے سبز اور سیاہ چیک والے مخصوص رومال سروں پر باندھے اور آگے پیچھے جھول جھول کر سبق پڑھنا شروع کر دیا۔ کبوتروں کے لیے سبق یاد کرنے کا یہ انداز ذرا نیا تھا اس لیے دونوں کبوتر کافی دیر تک دلچسپی سے بچوں کو دیکھتے رہے۔ بچے اتنی بلند آواز میں سبق یاد کر رہے تھے کہ کوئی دوسری آواز سنائی ہی نہ دیتی تھی۔ بچوں کے سبق یاد کرنے کا عمل قریب قریب ایک گھنٹہ جاری رہا۔ اب ایک استاد صاحب اپنے حجرے سے برآمد ہوئے اور انہوں نے ایک ایک بچے سے سبق سننا شروع کر دیا۔ جس بچے کو سبق یاد ہوتا استاد صاحب اسے اگلا سبق پڑھا دیتے اور وہ استاد صاحب سے اس طرح رخصت ہوتا جیسے قید سے چھوٹ رہا ہو۔ جن بچوں کو سبق یاد نہیں تھا وہ علیحدہ ایک قطار میں کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ جب سبق سنانے والے بچے جا چکے تو استاد نے ان بچوں کا رخ کیا جو قطار میں کھڑے تھے۔ استاد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر قطار میں کھڑے بچوں کی آنکھیں خوف اور دہشت کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

استاد نے ایک ایک بچے کا سر اپنی ٹانگوں میں دبا کر پیٹھ اور کولہوں پر اتنے زور کی چھڑیاں ماریں کہ بچے بلبلا اٹھے۔ بچوں کی چیخیں سن کر کبوتروں کے ننھے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ آخری بچے کو پھینٹی لگانے سے فارغ ہوئے تو خود استاد صاحب بے حد تھک چکے تھے۔ تیز تیز سانسوں کی وجہ سے ان کے ناک کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور ہونٹوں کے دونوں کونے جھاگ زدہ تھے۔ پاس سے گزرتے

ہوئے ایک بوڑھے استاد نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ صاحب مار پیٹ میں ہاتھ ہولا رکھا کریں۔ جواب میں استاد صاحب نے صرف ایک جملہ کہا اور اپنے حجرے میں داخل ہوگئے۔ ایہہ حرامی پیار دی گال کینی سندے'' یعنی یہ حرامزادے پیار کی بات نہیں سنتے۔ اب کبوتری کہنے لگی کہ پڑھائی کے لیے بچوں کو مارنا نہیں چاہیے۔ کبوتر نے کبوتری سے اختلاف کیا، اس کا خیال تھا کہ اگر بچوں کو مار کا خوف نہ ہو تو وہ کبھی بھی سبق یاد نہ کریں۔ کبوتری بضد تھی کہ بچوں کی توجہ علم کی طرف راغب کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں مگر کبوتر کا کہنا تھا کہ خاص طور پر تیسری دنیا کے لوگوں کے پاس وہ جدید آڈیو ویڈیو تکنیک بہم پہنچانے کے ذرائع نہیں ہیں۔ بہرحال ان کی یہ بحث بے نتیجہ ہی رہی۔ دوپہر ہوئی اور بچوں کے لیے چاول اور دال کی دیگیں پکیں۔ صدقے کی سریاں اور ایک بکرا بھی پکایا گیا مگر گوشت صرف استادوں کے حصے میں آیا۔ عصر کی نماز کے بعد پڑھائی کا ایک اور دور چلا اور صبح ہی کی طرح پھر کچھ بچوں کی مرمت ہوئی اور رات پڑ گئی۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد تمام بچے فرش پر لگے اپنے اپنے بستروں میں گھس گئے۔ کچھ تو جلد ہی سو گئے اور کچھ نے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گپیں ہانکنا اور ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کرنا شروع کردیں۔ کچھ نے سوئے ہوئے بچوں کے نالے کھینچنا شروع کردیئے۔ رات کچھ اور بھیگ چکی تو سوائے ایک دو بچوں کے باقی سارے سو گئے۔ جاگنے والے ایک دو بچوں نے اپنے سرہانوں کے غلافوں میں سے فلمی رسالے نکالے اور ان کو پڑھنا اور ان میں چھپی فلمی اداکاروں کی تصویریں دیکھنا شروع کردیں۔ کسی استاد کی آنکھ کھلی اور اس نے دور سے آواز لگائی کہ بلب بجھا دو اور سو جاؤ، جو بچے جاگ رہے تھے انہوں نے بھاگ دوڑ کے عالم میں بلب کا سوئچ آف کیا اور سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں کی طرف بھاگے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک بچے کے پنڈلی کی چنبل میں خارش شروع ہوگئی۔ وہ

بستر سے اٹھا اور انداز ے کے ساتھ گرتا پڑتا دروازے تک آیا اور وہاں سے سیدھا
مدرسے کے مین ہال میں چلا گیا اور سرسوں کے تیل والے دیئے کے طاقچے کے
پاس پہنچ کر انگلی سے اپنی چنبل پر تیل لگانا شروع کر دیا۔ مشکل سے ابھی اس نے دو
انگلیاں لگایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اسے کرتے کے کالر سے دبوچ لیا، خوف
سے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو استاد صاحب اسے اپنی لال آنکھوں سے گھور رہے
تھے۔ استاد نے اپنی گرجدار آواز میں پوچھا، ''کیا کردیں'' کیا کر رہے ہو، بچے نے
جواب دیا کہ استاد صاحب زخم پر تیل لگا رہا ہوں۔ استاد نے پھر غصے سے کہا
''تیکوں میں تیل لاندیں'' تمہیں میں تیل لگاتا ہوں اور اس کا بازو پکڑ کر اسے
حجرے میں لے گئے۔ استاد نے لنگوٹ باندھا اور شاگرد کو مالش کا کہہ کر خود اپنی
آنکھیں بند کر لیں۔ شاگرد نے سر سے پیروں تک استاد کی مالش کی اور پتہ نہیں
رات کے کس پہر واپس جا کر سو گیا۔ کبوتر اور کبوتری بھی دن بھر کی اور پھر آدھی
رات تک کی لمبی آبزرویشن سے تھک چکے تھے اور اب مینار کے طاقوں میں بیٹھے
بیٹھے سو گئے۔ اگلی صبح پھر سپیکر کی آواز نے ان کو بیدار کر دیا۔ اس صبح بھی مدرسے کی
پڑھائی اور بچوں کی ٹھکائی کا وہی معمول رہا۔ عصر کے بعد سبق نہ یاد کرنے والے
بچوں کی علیحدہ قطار بنی، ان سب کو مار پڑی مگر ایک بچے کو اس قطار سے بھی علیحدہ
کر کے کھڑا کیا گیا۔ اس بچے کو دوسرے بچوں سے زیادہ مار پڑی اور استاد صاحب
نے اسے مدرسے کے صحن میں سزا کے طور پر کھڑا کر دیا۔ عشاء کی جماعت بھی ہوگئی
مگر وہ بچہ وہی کھڑا رہا۔ سارے بچے اپنے اپنے بستروں میں جا کر سو چکے، بتیاں
بجھ گئیں اور استاد اپنے حجروں میں چلے گئے مگر بچہ وہیں کھڑا رہا۔ سردی کی وجہ سے
بچے نے بری طرح کانپنا شروع کر دیا اور اس نے اپنی پسلیوں کو زور زور سے دبانا
اور ملنا شروع کر دیا، شاید سردی کی وجہ سے اس کے سینے میں درد ہو رہا تھا۔ کبوتروں
نے سوچا کہ شاید استاد کو یاد نہیں رہا کہ وہ بچے کو اندر جانے کا کہتے۔ بچہ اپنے طور

پر خوفزدہ تھا کہ اگر اندر چلا گیا تو جانے استاد اسے کتنا مارے۔ چھاتی کے درد کی وجہ سے بچے کی سانسیں اکھڑنا شروع ہوگئیں۔ کبوتر اور کبوتری نے اپنے دل میں بچے کی بے بسی کا بہت کرب محسوس کیا مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ صبح کے وقت دوسرے بچوں اور استادوں نے دیکھا کہ بچے کا جسم اکڑ چکا تھا۔ سارے شہر میں کہرام مچا، اخبارات میں لے دے ہوئی اور کبوتر اور کبوتری دل دماغ پر بہت بڑا بوجھ لیے یہاں سے روانہ ہوئے۔

کبوتر اور کبوتری نے اپنے مشاہدے کی مزید تقویت کے لیے ایسے ہی ایک لڑکیوں کے مدرسے کا مشاہدہ کیا مگر اس کی حالت بھی پہلے سے مختلف نہ تھی۔ یہاں بھی علم کی وہی سختیاں تھیں اور فطرت کی رنگ رلیاں بھی۔ یہ بات بھی کبوتروں کے مشاہدے میں آئی کہ یہاں پڑھنے والی لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح محروم طبقے کی نمائندہ تھیں۔ یہ جو مذہب کی تعلیم حاصل کرنے والی تھیں چہ جائیکہ معاشرہ ان کو عزت دیتا بلکہ ان میں احساس محرومی پیدا کر رہا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ گروپ کی صورت میں رہنے کی وجہ سے یہ لڑکیاں عام گھریلو لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور جہاندیدہ ہوگئی تھیں۔ اب ان کو موت کا منظر پڑھنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ یہاں بھی پوری دنیا کی طرح علم و تربیت اور فطرت کے مابین زبردست کشمکش جاری تھی۔ کبوتری کو یہ سب دیکھ کر بریڈفورڈ کے زنانہ چرچ کا منظر یاد آ گیا کہ جہاں مادام سسٹر شرارتی لڑکیوں کی پنڈلیاں اور کولہے ننگے کر کے چھڑیاں مارتی تھی مگر وہ دو دو کی صورت میں چوری چھپے چرچ کے پچھواڑے جانے سے باز نہ آتی تھیں۔

کبوتر اور کبوتری نے اب دوسری قسم کے تعلیمی اداروں یعنی عام گورنمنٹ کے سکولوں کا رخ کیا۔ ان دنوں ان سکولوں کے بارے اخبارات میں ایک خاص ٹرم یعنی گھوسٹ سکول استعمال ہو رہی تھی۔ ذرا تحقیق پر کبوتروں کو پتہ چلا کہ ان سکولوں سے مراد ایسے سکول ہیں کہ جن کا وجود صرف کاغذوں میں ہے اور ان کے اساتذہ

گھر بیٹھے اپنے حصے کی تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ جو سکول واقعی موجود تھے ان کی حالت انتہائی دگرگوں تھی۔ نہ بچوں کے لیے کمرے، نہ بنچ، نہ ٹاٹ، نہ فلش اور نہ استاد۔ جو استاد آتے تھے وہ بھی حاضری لگا کر اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ سیاسی دور میں تو ان استادوں کی اور بھی موجیں تھیں کیونکہ ہر استاد کسی نہ کسی سیاسی حلقے سے تعلق رکھتا تھا اس لیے محکمہ تعلیم کا کوئی افسر کسی استاد کو اس کی غیر حاضری پر یا برے رزلٹ پر سزا دینے سے قاصر تھا۔ کبوتر اور کبوتری نے ان سکولوں کی پڑھائی کا جائزہ لینے کے لیے دور دراز کے دیہات کا دورہ کیا۔ دیہات کے اسکولوں کی حالت زیادہ ہی خراب تھی۔ استاد ذات برادری کے قائل تھے اور مخالف ذات برادری کے بچوں کو جان بوجھ کر اچھی تعلیم دینے سے گریز کرتے تھے، مبادا ان کی مخالف برادری کے بچے پڑھ لکھ جائیں۔ کبوتر بہت حیران ہوئے کہ وہ تو تمام کبوتروں کو کبوتر اور تمام کوؤں کو کوے ہی سمجھتے تھے جبکہ یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا، ایک جیسے انسان جو کہ ایک ہی ملک کے رہنے والے اور ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے مگر انہوں نے خود کو ذات برادری کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں اس طرح قید کر رکھا تھا کہ ہر کوئی دلی طور پر دوسرے کا برا چاہتا تھا۔ اگر ان کو سزا کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے کی جان لینے سے بھی ہرگز نہ چوکتے۔ اس ماحول میں کبوتروں کے لیے کافی مواد موجود تھا جسے وہ کوؤں میں متعارف کروا کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر سکتے تھے۔ کبوتروں نے دو تین دن کی مشقت کے بعد اس ماحول سے متعلق سمری یاد کی اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

کبوتر اور کبوتری کا اگلا ہدف تیسری اور چوتھی قسم کے تعلیمی ادارے تھے یعنی ایسے سکول اور کالج جو پرائیویٹ بزنس کے طور پر چل رہے تھے یا وہ جو بیوروکریٹ اور کاروباری طبقے نے مل کر صرف اپنے بچوں کے لیے بنائے تھے۔ ایسے ہی ایک وسیع وعریض سکول کے آڈیٹوریم کی عمارت کو کبوتروں نے اپنا مسکن بنایا۔ آڈیٹوریم

کا نام شیخ آڈیٹوریم تھا۔ کبوتری نے معصومیت سے پوچھا کہ کیا اس سکول میں شیخ پڑھتے ہیں جو اس آڈیٹوریم کا نام شیخ آڈیٹوریم رکھا گیا ہے۔ کبوتر نے کہا، نہیں بیوقوف یہاں بچے پڑھتے ہیں اور آڈیٹوریم کا نام اس لیے شیخ رکھا گیا ہے کہ اسے کسی شیخ قسم کے انسان نے اپنے پیسوں سے بنوایا ہے۔ کبوتروں نے دیکھا کہ سکول میں نوع نوع کے سٹال لگے ہوئے ہیں، کوئی فن فیئر وغیرہ منایا جارہا تھا۔ پانچویں جماعت تک مخلوط تعلیم کی وجہ سے چھوٹے لڑکے لڑکیاں اکٹھے فن فیئر میں شریک تھے جبکہ بڑی جماعتوں کے لڑکے اپنے کیمپس کی دیواروں پر یا قریبی عمارت کی چھت سے لڑکیوں کے کیمپس کا فن فیئر انجوائے کررہے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ کہیں چوڑیوں کا سٹال، کہیں مہندی کا سٹال، کہیں گول گپے، کہیں فروٹ چاٹ اور کہیں کھانا پکانے کے مقابلے۔ ہر بچے کی جیب میں ضرورت سے زیادہ رقم موجود تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بچے یہاں پڑھنے نہیں بلکہ اپنے خاندان کی جائز و ناجائز دولت کی نمائش کرنے آئے ہیں۔ خواتین اور مرد اساتذہ ٹولیوں کی صورت میں ایک دوسرے کے لباس اور خدوخال کی تعریفیں کررہے تھے۔ شام تک کبوتروں نے بھی اس تفریح سے بہت لطف اٹھایا، ہر طرف گویا رنگ ونور کی بارش لگی تھی۔ سکول بند ہوا اور بچے بچیوں نے کاروں اور ویگنوں میں بیٹھ کر اپنے گھروں کو جانا شروع کردیا۔ جو استاد لوکل تھے وہ اپنے گھروں کو چلے گئے اور باقی سٹاف ہوسٹل میں چلے گئے۔ خواتین اساتذہ کا ہوسٹل الگ تھا۔ تھوڑی سی شام ڈھلی اور کچھ اندھیرا ہوا تو کبوتر اور کبوتری نے دیکھا کہ خواتین اساتذہ ہوسٹل کے سامنے سبز نمبر پلیٹ والی کاریں آ کر رکنا شروع ہوگئیں۔ کبوتر حیران تھے کہ ان کاروں سے اترنے والے مردوں کو خواتین ہاسٹل میں جانے سے کوئی نہ روک رہا تھا۔ یہ لوگ بڑی آزادی سے خواتین کے کمروں میں گھس رہے تھے۔ کھانے منگوائے جارہے تھے۔ قہقہے بلند ہورہے تھے اور کہیں کہیں تو شراب کے دور بھی چل رہے

تھے کبوتری ایک روشندان پر کافی دیر سے نظریں جمائے دیکھ رہی تھی۔ کبوتر بھی اس کے قریب آ گیا اور اب دونوں ہی ایک منظر دیکھنے لگے۔ کبوتری نے شرماتے ہوئے پوچھا کہ یہ افسر اور استانی کیا کر رہے ہیں تو کبوتر نے شرارت میں کبوتری کے سر پر ٹھونگا مارا اور بولا کہ وہی کر رہے ہیں جو تم مجھے آج کل نہیں کرنے دے رہی۔ کبوتری ایک دم جھینپ کر اڑی اور اس کا پر روشندان کے شیشے سے ٹکرایا۔ کبوتر نے دیکھا کہ اس ہلکے سے کھٹکے پر اندر کے لوگ اس طرح ہڑ بڑائے کہ جیسے چور چوری کرتے ہوئے چونکتا ہے۔ کبوتر اب آڈیٹوریم کے کنگرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد کبوتری بولی کہ یہ لوگ اپنی قوم کو کیا پڑھا رہے ہیں، وہی ناں جو کہ یہ خود پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ کبوتر ایک دم کبوتری کے قریب آیا اور اس کی گردن میں گرمجوشی سے گردن ڈالتے ہوئے بولا، بیوقوف یہ پڑھا نہیں رہے بلکہ موج منا رہے ہیں۔ آؤں ناں ہم بھی ذرا موج منالیں۔ کبوتری نے ایک دوبار منع کیا مگر کبوتر کی ہٹ دھرمی اور اپنی چشم گرامی کی وجہ سے وہ بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ کبوتر اور کبوتری کو کچھ ہوش نہ تھا، انہیں اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ روشندان میں بیٹھے کمرے کے اندر کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ انہیں اس وقت ہوش آیا جب انہیں سردی محسوس ہونے لگے۔ دونوں نے اپنی گردن کے بال پھلائے اور اپنے سران میں چھپا کر سو گئے۔ اگلے دو چار دنوں میں کبوتروں نے ان سکولوں کے نظامِ تعلیم اور سلیبس کا جائزہ لیا۔ جو عام پرائیویٹ سکول تھے ان کا مقصد صرف اور صرف پیسہ کمانا تھا جبکہ ان کی پڑھائی نہ ہونے کے برابر تھی جبکہ خاص قسم کے پرائیویٹ سکولوں کا نظامِ تعلیم اور سلیبس اس لحاظ سے منفرد اور مختلف تھا کہ اس کا مقصد ایک خاص قسم کے طبقے کی پرورش تھی جس کا مقدر عوام پر حکومت کرنا اور ان کے فنڈ خرد برد کرنا ہے۔ شاید اسی طبقے کی تخلیق کے بارے میں لارڈ میکالے نے وائسرائے کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ”اس کے نظامِ تعلیم کا

مقصد ہندوستان میں ایک ایسی کلاس پیدا کرنا ہے جو اپنے رنگ، نسل اور زبان کے لحاظ سے تو مشرقی ہو مگر اپنے خیالات اور اعمال کے اعتبار سے انگریز۔" لارڈ میکالے کی روح کو داد دینی چاہئے کہ اس کا نظام تعلیم اتنا کامیاب رہا کہ ڈیڑھ صدی گزرنے پر بھی اس کی افادیت میں ذرا برابر فرق نہیں آیا بلکہ یہ "افادیت" روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ کبوتر سوچ رہے تھے کہ انہیں بھی کسی ایسے ہی تعلیمی نظام کی ضرورت ہے جسے وہ کوؤں میں متعارف کروا کر انہیں چھوٹے چھوٹے طبقاتی گروہوں میں تقسیم کر سکیں۔

کبوتروں کو یاد آیا کہ مہان کبوتر نے مہم پر بھیجنے سے پہلے انہیں یہ بھی باور کروایا تھا کہ وہ برصغیر کے سیاسی اور اقتصادی نظام کا بھی جائزہ لیں تاکہ ان کی خرابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوؤں میں بے اتفاقی کو فروغ دینے میں مدد مل سکے۔ برصغیر پاک و ہند میں مذہبی و تعلیمی نظام کی تفاوت کے مطالعے و مشاہدے کے دوران یہاں کے سیاسی و اقتصادی نظام کی کچھ ایسی کمزوریاں بھی کبوتروں کی نظر سے گزریں کہ جو ان کے مشن کی کامیابی میں سنگ میل کا کام دے سکتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ برصغیر کی سیاست کا مقصد دراصل امیر طبقے کی غریب طبقے پر اجارہ داری اور تسلط کو نہ صرف یہ کہ قائم رکھنا بلکہ مضبوط سے مضبوط تر کرنا ہے۔ اپنے اس گھناؤنے مقصد کے لیے یہاں کے سیاستدان ہر قسم کی دھونس، دھاندلی، مکروفریب اور دہشت گردی کو جائزہ قرار دے چکے تھے۔ اس استحصالی اور طبقاتی نظام کے خلاف ہر الیکشن کے موقع پر کچھ اکا دکا آوازیں ملک کے کسی کونے کھدرے میں اٹھتی سنائی دیتی تھیں مگر دولت اور طاقت کے بل بوتے پر ان کو ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سلا دیا جاتا تھا۔ کوئی شریف آدمی الیکشن میں حصہ لینے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہ تھا۔ زانی، شرابی، چور، رسہ گیر قسم کے لوگ بڑے دھوم دھڑکے سے ایوانوں پر قابض تھے۔ یہ بات بھی کبوتروں کے مشاہدے میں تھی کہ آزادی کے بعد برصغیر

میں سیاست اور حکومت میں عوام کی شمولیت عملی طور پر صفر تھی۔ ظلم و بربریت کے بل بوتے پر استحصالی طبقے نے بیوروکریسی سے مل کر مفادات کے لمبے چوڑے کھاتے کھولے ہوئے تھے۔ عوام کی بات سننا تو درکنار، ان کے بات کرنے کے مواقع ہی مفقود کر دیئے گئے تھے۔

کبوتروں کی خوش قسمتی کہئے کہ ان دنوں جنوبی پنجاب میں بلدیاتی انتخابات کا شہرہ تھا۔ جماعتی بنیاد پر انتخابات کی وجہ سے حلقہ کے ایم این اے اور ایم پی اے کے ڈیروں پر دن رات کے چوبیس پہر جم غفیر امڈا رہتا تھا۔ بہت سے فارغ اور نکمے لوگوں کو تفریح کا ایک موقع میسر آ گیا تھا۔ ان میں سے اکثر سیاسی لوگوں کی حویلیوں میں پڑے ٹکڑے توڑتے رہتے تھے۔ تین وقت کی مفت روٹی اور دو تین وقت کی چائے کو وہ موج اور منافع سے تعبیر کرتے تھے مگر ان کو یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ پیسے جن سے یہ تمام اخراجات پورے ہو رہے تھے دراصل ان کے اپنے ہی پیسے تھے۔ ان کے بچے بچیوں کے سکولوں کے فنڈ تھے یا ان کے علاقے میں ہسپتال یا ڈسپنسری کی رقم تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ تو اتنا شعور تھا اور نہ جرأت کہ وہ اپنے حلقے کے نمائندے سے استفسار کر سکیں کہ اس کے پاس اتنا وافر پیسہ کہاں سے آیا اور یہ کہ ان کے علاقے کی ترقی کے لیے کس مد میں کتنی رقم ملی اور وہ کہاں اور کیسے خرچ ہوئی۔ وہ تو بیچارے بس اتنے میں خوش تھے کہ ان کو کچھ دنوں کے لیے روٹی پانی مفت مل رہا تھا۔

سیاسی لوگوں کے ڈیروں پر کبھی ایک گروہ اپنی تمام تر افرادی قوت، اسلحے اور بدمعاشوں کے جلوؤں میں جلوہ گر ہو جاتا اور کبھی دوسرا۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ پارٹی ٹکٹ اس کو مل جائے۔ پارٹی ٹکٹ ملنے کا مطلب یہ تھا کہ ٹکٹ ہولڈر ہر حال میں اپنی نشست جیت جائے گا چاہے اس کے لیے علاقے کے ایم این اے یا ایم پی اے کو ڈرانے دھمکانے سے کام لینا پڑے یا غنڈہ گردی اور اغوا سے کام چلے،

بہر حال یہ ایم این اے اور ایم پی اے کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنے بندوں کو کامیاب کرائے چاہے وہ جیسے بھی کردار کے مالک ہوں۔ یہ حساب کتاب بھی لگائے جا رہے تھے کہ فلاں حلقے میں فلاں برادری کے اتنے ووٹ ہیں اور فلاں برادری کے اتنے ووٹ ہیں۔ امیدواروں کے کاغذات جمع کروانے سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی یہ گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے کے ووٹ توڑنے کے لیے نت نئے منصوبے آزمائے جا رہے تھے۔ کبوتروں نے سارے علاقے میں گھوم پھر کر اپنے قریبی مشاہدے کے لیے تحصیل کامونکی کی ایک یونین کونسل کو مرکز بنایا۔ اس حلقے میں بھی باقی حلقوں کی طرح زبردست جوڑ توڑ جاری تھا۔ اسلحے کی بھرپور نمائش کے ساتھ مختلف گروہ ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے ایم این اے اور ایم پی اے پر طرح طرح سے دباؤ ڈال رہے تھے۔ سیاسی وڈیروں نے حسب سابق برادری کے ووٹوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایسے لوگوں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیئے جو چاروں گن پورے تھے۔ کبوتری کہنے لگی کہ ذات برادری سے کیا مراد ہے؟ کیا تمام انسان ایک برادری سے تعلق نہیں رکھتے۔ کبوتر نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگا کہ بظاہر تو تمام انسان ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سیاسی مفاد پرستوں نے ان کو مزید چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ وہ آپس میں لڑتے رہیں اور انہیں ان کے کالے کرتوتوں کا علم ہی نہ ہو سکے۔

کبوتروں نے دیکھا کہ کچھ لوگ بڑے بڑے جتھوں کی شکل میں بھنگڑا ڈالتے، ڈھول بجاتے اور ہوائی فائرنگ کرتے اپنے امیدوار کے کاغذات نامزدگی جمع کروانے جا رہے ہیں۔ اس یونین کونسل میں حکومتی یا جماعتی امیدوار کے علاوہ بھی ایک شخص نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی جمع کروائے مگر اس کے ساتھ نہ تو ڈھول باجے والے تھے اور نہ بندوقوں والے۔ یہ شخص اس علاقے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شریف خاندان سے تعلق رکھنے والا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اس نے ملک و قوم کی

تقدیر بدلنے کے خواب دیکھے تھے۔ اب وہ اپنے خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عملی سیاست میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ بڑا مان تھا اسے اپنی شرافت کا اور پڑھے لکھے ہونے کا۔ وہ الیکشن کمیشن کے ضابطہ انتخاب پر پوری طرح عمل پیرا تھا۔ کبوتر اور کبوتری نے سوچا کہ کیوں نہ اس شخص کے گھر جا کر دیکھیں کہ وہ الیکشن کے لیے کس طرح مصروف ہے۔ دونوں کبوتر شام کے بعد اس شخص کے صحن میں کھڑے پیپل کے گھنے درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ وہ حیران تھے کہ اس امیدوار کے گھر کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ صرف امیدوار اور اس کا چچا ایک چارپائی پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں مبتلا تھے۔ چچا نے حقے کا بڑا کش لیا اور کہنے لگا یار تم نے اس بار پھر انتخابات کا پنگا لے کر مجھے پریشان کردیا ہے۔ تم کبھی بھی اس قوم کی تقدیر کو نہیں بدل سکتے۔ یہ قوم جب خود اپنی تقدیر کو نہیں بدلنا چاہتی تو تم کیوں اس کا فکر کرتے ہو۔ تمہارا مقابلہ انسان سے نہیں بدمعاش سے ہے بلکہ بہت سارے بدمعاشوں سے ہے۔ تم کس کس سے لڑو گے اور کس کس کو سمجھاؤ گے۔ چاہے جتنا سمجھا لو یہ لوگ کبھی ہمیں ووٹ نہ دیں گے۔ یہ لوگ صرف اور صرف اپنی ذات برادری کے بندے کو ووٹ دیں گے چاہے وہ کتنا ہی لچا لفنگا کیوں نہ ہو۔ اگر کسی نے تمہارے کہنے پر جرأت کر بھی لی تو وہ ایم این اے یا ایم پی اے کی بڑک سے بدک جائے گا۔ امیدوار نے گہری سانس لی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا، چاچا مجھے پتہ ہے کہ یہ لوگ کبھی بھی مجھے ووٹ نہ دیں گے مگر میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ دھونس اور دھاندلی کا نظام آخر کب تک چلے گا۔ اگر میں بھی اپنے کاغذات واپس لے لوں تو حلقے کے لوگوں کے پاس کوئی چوائس ہی باقی نہ رہے گی۔ فی الحال تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ لوگوں کو انتخابی منشور اور انتخابی نشان وغیرہ سے آگاہ کرنے کے لیے پمفلٹ چھپوانے پڑیں گے اور پمفلٹ چھپوانے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے اور لوگوں کو پولنگ سٹیشنوں تک کیسے پہنچائیں گے۔ چچا نے جذباتی انداز میں

کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو میرے پاس چار بھینیس ہیں، کچھ کرلیں گے۔

کبوتر اور کبوتری اگلے دن دوسرے امیدوار کے گاؤں کی طرف اڑ گئے اور امیدوار کی حویلی کی جالیوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ تیس چالیس کے قریب چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ فاتحانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک گروپ بندوقیں صاف کرنے کے ساتھ ساتھ پانچ دس منٹ کے وقفے سے ہوائی فائرنگ سے شغل کر رہا تھا۔ حویلی کے ایک کمرے میں کھلے عام شراب کی بوتلیں اور چرس کے چھتر پڑے تھے اور کچھ لوگ ان کے قریب نشے میں دھت بیٹھے تھے۔ کبوتروں نے ادھر ادھر تجسس بھری نظروں سے دیکھا اور لوگوں کی گفتگو سے معلوم کیا کہ امیدوار ساتھ والے گاؤں میں ووٹ مانگنے گیا ہے۔ کبوتری کے اصرار پر کبوتر بھی اس گاؤں جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ ابھی گاؤں کے اوپر اڑ رہے تھے کہ انہیں ایک گلی میں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ایک شخص جس نے دھوتی باندھی ہوئی تھی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ گاؤں کے جوانوں اور بچوں میں اپنے اشتہار اور نئے نوٹ تقسیم کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی لالی بتا رہی تھی کہ خوب پی کر آیا ہے۔ لہر میں آ کر امیدوار نے ایک روپے کے نئے پیکٹ کو ہوا میں بکھیرا تو بچے روپوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس گھمسان میں کسی بچے کا پاؤں امیدوار کی دھوتی پر آ گیا اور دھکم پیل میں اس کی دھوتی کھل گئی۔ امیدوار کو نشے میں ہوش ہی نہ تھا کہ اس کی دھوتی گر گئی ہے۔ وہ اسی طرح جھاگ والے منہ کے ساتھ گالی نما نعرے لگا رہا تھا۔ دو تین لوگوں نے جلدی سے اس کی دھوتی اس کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ دی اور اسے اس کی دلیری پر شاباش دی۔

کبوتروں نے دیکھا کہ انتخابات سے ایک دن پہلے کچھ سرکاری اہل کار بیلٹ بکس، بیلٹ پیپرز اور دوسرے ضروری سامان کے ساتھ پولنگ سٹیشنوں پر پہنچنا شروع ہوگئے۔ ہر پولنگ سٹیشن پر حکومتی امیدوار کے کارندوں نے عملے کا بھرپور

استقبال کیا۔ ان کے آرام کے لیے چارپائیاں بچھائی گئیں اور نئے بستر لگائے گئے۔ کھانے پینے کے لمبے چوڑے انتظامات کئے گئے۔ رات کچھ ڈھل چکی تو کبوتروں نے ایک پولنگ اسٹیشن میں دیکھا کہ کچھ لوگ بیلٹ پیپروں پر ٹھک ٹھک مہریں لگا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ انہیں بیلٹ بکسوں میں بھرتے جارہے ہیں۔ انتخابی فہرستیں دیکھ کر ووٹ بنائے جارہے ہیں۔ اس کے بعد کبوتروں نے یونین کونسل کے تمام پولنگ اسٹیشنوں پر جاکر دیکھا کہ وہاں بھی ایسے ہی حالات تھے۔ صبح ہوئی تو دکھاوے کے لیے انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا اور یہ ڈھونگ عصر تک جاری رہا۔ اس کے بعد ووٹوں کی گنتی ہوئی اور رات گئے دھوتی والے امیدوار کو غیر سرکاری طور پر تمام پولنگ اسٹیشنوں پر کامیاب قرار دے دیا گیا۔ کبوتروں کو اس بات سے تو کوئی دلچسپی نہ تھی کہ کون جیتا اور کون ہارا البتہ غیر نظریاتی گروہ بندی کا ایسا فارمولا ضرور ان کے ہاتھ لگ گیا تھا جسے وہ کوؤں میں متعارف کروا کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرسکتے تھے۔

اپنی مہم کے انتہائی آخر میں کبوتروں نے برصغیر پاک و ہند کے اقتصادی حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اقوام متحدہ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کے اعداد و شمار کے مطابق یہاں کے افراد کی سالانہ آمدن ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ اکثریتی آبادی یعنی پچاس فیصد یا اس سے زیادہ آبادی بین الاقوامی معیارِ غربت سے بھی نچلے درجے کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ ایک پانچ سے سات افراد پر مشتمل اوسط خاندان کی ماہانہ آمدنی پندرہ سو روپے یا اس سے بھی کم تھی۔ اس غربت ہی کا شاخسانہ تھا کہ ہر سال ہزاروں بچے، خواتین اور مرد ناقص خوراک، گندے پانی اور صحت کی سہولیات نہ ہونے کے باعث اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ یہ تو وہ قدرتی اموات تھیں کہ جن کو عام طور پر غریب ملکوں یا قوموں میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں اور نہ ان کے بارے میں

سوچنے کا رواج ہے۔ اس کے علاوہ بھی غربت کی وجہ سے بے شمار اخلاقی برائیاں جنم لے رہی تھیں۔ مثال کے طور پر ان ملکوں کے حقیقی شرح خواندگی تیس فیصد سے بھی کم چلی آ رہی تھی۔ عورتوں پر تشدد کے واقعات میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اغوا، قتل، ڈکیتی اور رہزنی کے واقعات معمول کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ غیرت کے نام پر خواتین کے قتل عام کا رجحان جوں کا توں موجود تھا۔ چائلڈ لیبر کا مسئلہ گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتا چلا جارہا تھا۔

یوں تو یہاں کا پورا معاشرہ ہی غربت اور جہالت اور ان سے جنم لینے والی اخلاقی برائیوں کی لپیٹ میں تھا لیکن ان کا سب سے بڑا شکار خواتین تھیں۔ جون ۲۰۰۰ء میں نیویارک میں منعقد ہونے والی عورتوں کا عالمی کانفرنس کی رو داد بھی کبوتروں کے علم میں تھی جس میں قرار دیا گیا کہ پاکستان، بھارت، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں خواتین کو خطرناک حالات میں زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ یوں تو عورتوں کا قتل آئے روز کا قصہ تھا پر تازہ ترین دو واقعات جن میں خواتین کو قتل کر دیا گیا تھا، خاص طور پر یہاں کے لوگوں میں زیر بحث تھے۔ قتل کے پہلے واقعے میں کاروکاری کے نام پر ایک خاتون کو قتل کیا گیا تھا۔ کبوتری کہنے لگی، یہ کاروکاری کیا ہوتی ہے۔ کبوتر نے بتایا کہ یہ ایک ایسی بھیانک رسم ہے جس میں ناجائز تعلقات کے شبے میں کسی عورت یا مرد یا پھر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ تازہ واقعہ جنوبی پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رونما ہوا تھا۔ کبوتر ایک دو دنوں میں متعلقہ گاؤں پہنچ گئے اور درختوں میں بیٹھ کر یا گھروں میں منڈیروں پر بیٹھ کر لوگوں کی گفتگو سے اصل واقعے کا معلوم کرنے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں کبوتروں کو یہ معلوم پڑ گیا کہ مرنے والی عورت کی عمر ساٹھ برس سے بھی زیادہ تھی جسے اس کے بیٹے نے کارو کہہ کر قتل کر دیا تھا۔ اس طرح جس شخص کو کاری کہہ کر ہلاک کیا گیا اس کی عمر بھی پینسٹھ برس سے زیادہ تھی۔ کبوتری کہنے لگی کہ اس عمر میں

کاروکاری کا کوئی تک نہیں بنتا! ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ قتل کی اصل وجہ کیا تھی۔ اصل وجہ معلوم ہونے تک انہیں کچھ دن اور اسی گاؤں میں رکنا پڑا۔ آخر کار انہیں پتہ چل ہی گیا کہ قاتل کا دو بیگھے زمین کا مقتول مرد سے جھگڑا چل رہا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے ظالم شخص نے نہ صرف یہ کہ مذکورہ آدمی کو قتل کردیا بلکہ کاروکاری کا الزام لگانے کے لیے اور گوٹھ کے لوگوں کے سامنے جواز پیش کرنے کیلیے اپنی بوڑھی ماں کو بھی قتل کردیا۔

عورت کے قتل کا دوسرا واقعہ بھارت کے علاقے راجستھان میں ہوا تھا جہاں ایک عورت کو درخت کے ساتھ باندھ کر گاؤں والوں نے تشدد کے ذریعے ہلاک کردیا تھا۔ ویسے تو یہ گاؤں اتنا دور تھا کہ شاید اس قتل کی بھی دوسرے ایسے قتلوں کی طرح کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی مگر ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کی ٹیم کو اس واقعے کی بھنک پڑ گئی اور انہوں نے اس واقعے کو عالمی سطح پر مشتہر کردیا۔ ٹی وی والوں کو صرف اتنا پتہ چل سکا تھا کہ جس عورت کو قتل کیا گیا وہ ڈائن تھی۔ کبوتری بولی یہ ڈائن کیا ہوتی ہے؟ کوؤں یا کبوتروں میں تو ڈائنیں نہیں ہوتیں۔ کبوتر بولا کہ انسانوں میں بھی ڈائن نہیں ہوتی لیکن جہالت کی بنیاد پر کچھ عورتوں کو ڈائن قرار دے دیا جاتا ہے اور پھر گاؤں یا بستی کا کوئی شخص ان سے نہیں ملتا اور نہ وہ کسی سے مل سکتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ایسی عورت کو قید تنہائی میں ڈال دیا جاتا ہے یا پھر قتل کردیا جاتا ہے۔ کبوتری کہنے لگی کہ اگر تمہیں ان سب باتوں کا پہلے سے علم ہے تو ہم یہاں کیوں آئے۔ کبوتر کہنے لگا کہ مجھے ان باتوں کا علم اس مہم پر روانہ ہونے سے کچھ دن قبل ہی ہوا جب پروگریسو ویمن ایسوسی ایشن کی مختلف رپورٹیں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر جاری ہوئیں۔ یہ ساری معلومات اپنی جگہ لیکن میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا کہ ان رپورٹوں کے حقائق کو اپنی نظروں سے دیکھ سکوں۔ کبوتری کہنے لگی، اس کا مقصد ہے کہ ہمیں راجستھان بھی جانا پڑے گا۔

کبوتر نے کہا ہاں ہم راجستھان جائیں گے تا کہ پتہ چل سکے کہ اس عورت کو کیوں قتل کیا گیا۔ راجستھان کے علاوہ کرناٹک، بہار اور اتر پردیش میں بھی اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

راجستھان کے مخصوص گاؤں پہنچنے میں کہ جہاں عورت کے قتل کا واقعہ ہوا تھا کبوتروں کو دس بارہ دن لگ گئے۔ ویسے بھی دونوں کبوتر اپنی لمبی مہم کی وجہ سے بہت تھک چکے تھے اس لیے کبھی اڑ لیتے اور کبھی آرام کرتے رہتے تھے۔ کبوتروں کی خوش قسمتی تھی کہ جس دن کبوتر گاؤں میں پہنچے اسی دن ٹی وی والوں کی ٹیم وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ٹیم کے ساتھ کچھ پولیس والے بھی تھے۔ ٹیم مختلف لوگوں سے معلومات کررہی تھی مگر انہیں کوئی کچھ نہ بتاتا تھا۔ آخر کار پولیس والوں کے ڈر سے قتل ہونے والی عورت کی بہن سارا واقعہ بتانے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ پچھلے ایک سال سے مذکورہ عورت کو گاؤں والوں نے منحوس اور ڈائن قرار دیا ہوا تھا۔ لوگ اس کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک دن وہ عورت اپنے گھر سے باہر نکلی تو گلی میں ہمسائے کا چھوٹا بچہ بلک رہا تھا۔ اس عورت نے اس معصوم بچے کو پانی پلا دیا۔ ایک دو دن بعد وہ بچہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور بچے کے گھر والوں اور گاؤں کے دوسرے لوگوں نے شور مچا دیا کہ ڈائن نے بچے کو بیمار کیا ہے اور بدلے میں اس عورت کو قتل کر دیا۔ یہ تو وہ واقعات تھے جو غربت اور جہالت کی وجہ سے برصغیر میں عام تھے۔ غربت اور جہالت کی وجہ یہاں کا اقتصادی نظام تھا۔ یہاں جو بجٹ بنتے تھے اور جو اقتصادی پالیسیاں بنائی جاتی تھیں ان کے بننے سے لیکر پایہ تکمیل تک پہنچنے میں بے ایمانی، سفارش اور کرپشن کے اتنے ٹھاٹھیں مارتے سمندر پڑتے تھے کہ ہر بار اقتصاد کی کشتی تختہ تختہ ہو جاتی تھی۔ کرپشن کی بھرمار اور اقربا پروری کے رواج کی وجہ سے امیر امیر ترین اور غریب غریب ترین ہوتا چلا جارہا تھا۔

کالے کبوتر اور سفید کبوتری نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کووں کی کامیابی کا راز شاید اسی میں چھپا ہے کہ ایک کوّا ابھی مر جائے تو سبھی کوے بغیر کسی تفریق کے غم و احتجاج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اب کووں سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ ان کو ذاتی مفادات کا لالچ دے کر چھوٹے چھوٹے غیر نظریاتی گروہوں میں تقسیم کردیا جائے۔ دونوں کبوتروں نے اطمینان کی سانس لی اور اپنی آنکھیں اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ان کی مراد کے بہت سے سورج چمک رہے تھے۔ سائز میں بڑا ہونے کی وجہ سے کالے کبوتر نے فکری بدحالی کے سورج کو لپیٹ کر اپنی آنکھ میں رکھا اور دونوں کبوتر اپنے جنگل کی طرف اڑ گئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ باقی تمام سورج خود بخود ان کے پیچھے اڑتے چلے آرہے تھے۔

﴿ختم شد﴾